یقین

شہید محراب
حضرت آیۃ اللہ
سید عبدالحسین دستغیب

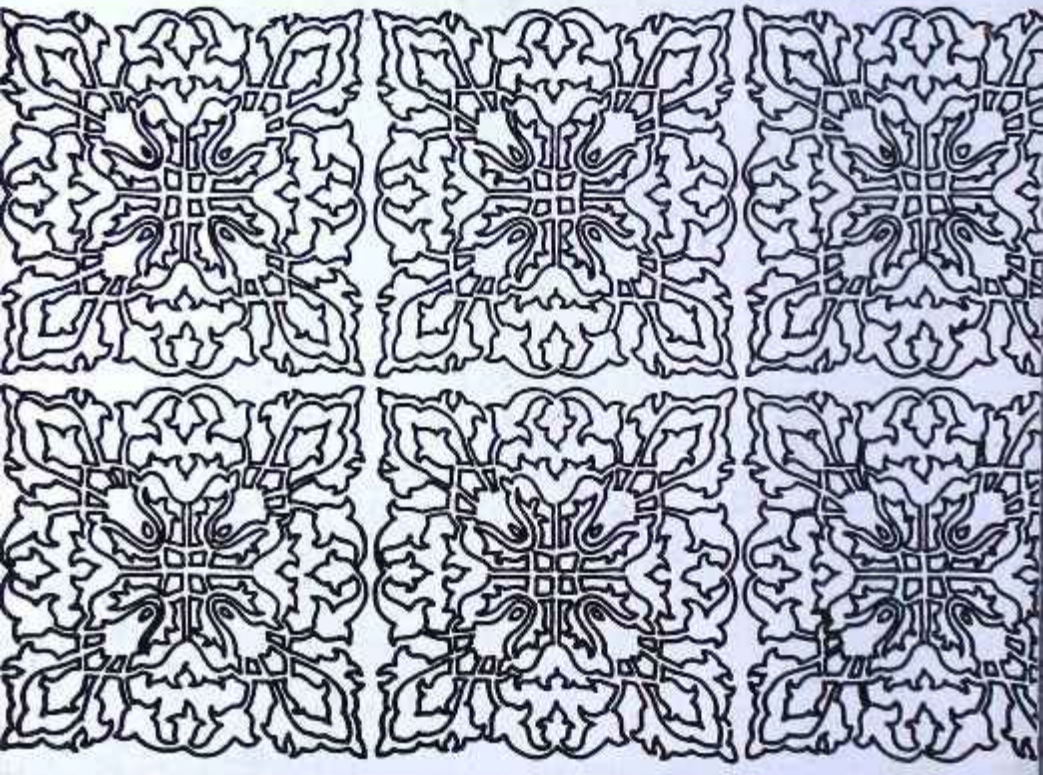

یقین

شہیدِ محراب

حضرت آیۃ اللہ

سید عبدالحسین دستغیب

☆

ناشر

خراسان بک سینٹر

۱۲۔ سنیعہ آرکیڈ ــ بریٹو روڈ ــ کراچی ۷۴۸۰۰

فون : ۷۲۱۴۷۱۷ - ۷۲۲۱۷۱۸

جملہ حقوق بحق ناشر محفوظ ہیں

نام کتاب .... یقین

مصنف .... آیت اللہ دستغیب

مترجم .... مولانا جمال احمد شہیدی

پیش کش .... سید شمس نجفی

ٹائیٹل .... انور کمال

کتابت .... حسین حیدر

طباعت .... لاریب پریس کراچی

اشاعت .... بار اول

ناشر .... خراسان بک سینٹر

کتاب ملنے کا پتہ

خراسان بک سینٹر

۱۲۔ سنیعہ آرکیڈ — برنٹیو روڈ — کراچی ۷۴۸۰۰

فون: ۷۲۱۴۷۱۷

فہرست مضامین

عنوان	صفحہ نمبر	عنوان	صفحہ نمبر
پیش لفظ	۵	عقائد پر یقین	۳۱
کمالِ معرفت اور یقین	۵	توحید افعالی پر یقین	۳۲
علم اور یقین کا فرق	۶	توحید افعالی پر یقین صادق	۳۳
اس دور کے اہلِ یقین	۸	تمام مخلوقات کا رازق	۳۳
مقدمہ	۱۰	ثواب اور عذاب پر یقین	۳۴
معرفت قلبی	۱۳	اللہ ہمارے ساتھ ہے	۳۵
اول الدین معرفت	۱۳	پاؤں تک نہیں پھیلاتے تھے	۳۶
خود پسندی کا علاج	۱۵	یقین صادق اور کاذب	۳۷
استعداد کے مطابق معرفت	۱۶	ایمان کی پہچان خوفِ خدا	۴۰
کیا علم حجاب اکبر ہے	۱۸	زمین و آسمان کی خلقت کا مقصد	۴۳
بصارتِ قلبی	۱۹	مسلسل کوشش	۴۹
یقین کے مطابق عمل	۲۱	خلوص و بندگی	۵۹
وہم کا غلبہ	۲۲	جہل سے معرفت ممکن نہیں	۶۱
صفاتِ الٰہی پر یقین	۲۲	شک اثر انداز نہیں ہونا چاہیئے	۶۲
نورِ یقین	۲۴	آئینہ دیکھنا	۶۳
نبوت پر یقین	۲۵	اہلِ یقین اور بقائے عالم	۶۷
اہلِ یقین کی پہچان	۲۸	جناب دانیال اور شیر	۷۰
عمل سے دعوت	۲۹	دنیا کی سختیاں	۷۱
کس کی صحبت میں رہیں	۲۹	ایمان میں اضافہ	۷۲
اہلِ یقین اور اطاعتِ امامؑ	۳۰	یقین کے درجات	۷۳

عنوان	صفحہ نمبر
کار خیر سے ایمان میں اضافہ	۷۴
حضرت یوسفؑ کی ہتھیلی کا نور	۷۵
بغض و عناد کا خاتمہ	۷۷
ایمان کا دوسرا درجہ	۷۹
یقین برقرار رہتا ہے	۷۹
ظن قوی	۸۱
ذہانت مومن کے لئے لازمی ہے	۸۲
یقین اور غور و فکر	۸۴
ایمان اور یقین کے مراتب	۸۵
یقین کے آثار	۹۴
توحید افعالی پر یقین	۹۵
ولایت و امامت پر یقین	۹۷
علیؑ اللہ کے ولی ہیں	۹۷
وضو میں پاؤں کا دھونا	۹۸
دعائے حزیں	۱۰۰
منزل یقین اور محنت و مشقت	۱۰۱
ہمیشہ عبرت حاصل کرو	۱۰۲
اطاعت میں نجات	۱۰۲
ایمان کی قوت	۱۰۵
پروردش کرنے والا خدا ہے	۱۰۶
خدا ہر جگہ موجود ہے	۱۰۷
ایمان برائی سے روکتا ہے	۱۱۰
مہاجرین اور نجاشی بادشاہ	۱۱۳
جادوگروں کا ایمان	۱۱۵
مومنین کو زندہ جلا دیا گیا	۱۱۷
یقین کی حفاظت کرو	۱۱۹
شرح صدر کی نشانیاں	۱۲۰
وحدانیت کا اقرار	۱۲۱
ذہانت اور عاقبت اندیشی	۱۲۴
ذہانت اور خدا پر ایمان	۱۲۵
رب العالمین کے معنی	۱۲۶
یقین سے توکل	۱۲۷
خدا پر زیادہ اعتقاد	۱۲۸
زیادہ تعلیم اور یقین	۱۲۹
کیا جنت اعمال کے عوض ملے گی	۱۳۰
وہ کام جو بلاشبہ اچھے ہیں	۱۳۱
وہ کام جو بلاشبہ برے ہیں	۱۳۲
مشکوک امور میں کیا کریں۔	۱۳۲

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

پیش لفظ

کمالِ معرفت اور یقین

اس میں کوئی شک نہیں کہ انسان کی قدر و قیمت اور اُس کی کامیابی اور کامرانیوں کا معیار یہ ہے کہ وہ اپنے پروردگار کی کتنی معرفت رکھتا ہے اور اللہ تعالیٰ کی صفات کو کس حد تک سمجھتا ہے۔

معرفت کا کمال، یقین میں مضمر ہوتا ہے۔ ایسا یقین کہ اگر ساری دنیا کے لوگ اس کے خلاف ہو جائیں تب بھی اس میں ذرہ برابر شک و تردد نہ پیدا ہونے پائے۔ یقین ایسا مقام و مرتبہ ہے جس کے بارے میں اہلِ یقین کے سردار امام المتقین حضرت علی ابنِ طالب علیہ السلام فرماتے ہیں:

لو کُشِفَ الغِطَاءُ لَمَا ازْدَدْتُ یَقِیْنًا یعنی "اگر تمام پردے ہٹا دیئے جائیں تب بھی میرے یقین میں کوئی اضافہ نہیں ہوگا۔"

ایک اور موقع پر جب حضرت علیؑ سے کسی نے پوچھا: "کیا آپ نے اپنے پروردگار کو دیکھا ہے؟ آپ نے فرمایا" وہ خدا جس کو میں نے نہ دیکھا ہو اُس کی عبادت کیسے کروں؟

اس کے بعد آپؑ نے سوال کرنے والوں کا جواب دیتے ہوئے اس امر کی وضاحت فرمادی کہ میں نے خدا کو ظاہری آنکھوں سے نہیں بلکہ دل کی آنکھوں سے دیکھا ہے۔

جی ہاں! مکتبِ ولایتِ علیؑ کے پیروکاروں نے بھی یقین کے اس بیکراں خرمن سے چند خوشے چُن لئے ہیں۔ اور اپنے ان معصوم رہنماؤں سے فیض حاصل کرتے ہوئے کچھ نہ کچھ یقین حاصل کیا ہے۔ جب ہم حضرت علیؑ کے اصحاب کی زندگیوں کا مطالعہ کرتے ہیں۔ اور دوسرے جلیل القدر علمائے دین کی زندگیوں پر نظر ڈالتے ہیں تو یہ حقیقت ہم پر واضح ہو جاتی ہے کہ کس طرح ان افراد نے اپنے آقا و مولا سے روحانی ارتباط پیدا کر کے مختلف درجات طے کرتے ہوئے یقین کی منزلِ کمال تک رسائی حاصل کی تھی۔

علم اور یقین کا فرق

اصطلاحی اعتبار سے علم اور یقین میں فرق ہے گو کہ اصل جاننے اور اعتقاد رکھنے کے اعتبار سے علم اور یقین دونوں مشترک ہیں۔ ممکن ہے علم میں وہم و گمان پایا جاتا ہو جس کی وجہ سے کسی نتیجے تک پہنچنے

میں رکاوٹ پیدا ہوتی ہو۔ البتہ جب انسان اپنی منزلِ یقین تک رسائی حاصل کرلیتا ہے تو وہ ہر طرح کے وہم و گمان سے دور ہوجاتا ہے۔

ممکن ہے جاننا اور دیکھنا یکساں نہ ہو۔ انسان کسی بات کو جان تو لے لیکن وہ اس کے نزدیک آنکھوں سے دیکھنے کے مساوی نہ ہو۔ یقین جو کچھ جانتا ہو اُسے آنکھوں سے دیکھنے کو کہتے ہیں۔ یقین حقیقت پر پڑے ہوئے قیاس و خیال کے پردے کے ہٹ جانے کو کہتے ہیں عالم، توحید اور معرفتِ الٰہی کے بارے میں خواہ کتنا ہی آدمی جان لے آدمی اپنی ذات، شخصیت، اخلاقی خصوصیات اور نفسانی خواہشات سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ لیکن جب کوئی شخص منزلِ یقین تک رسائی حاصل کرلیتا ہے تو اپنے نفس کی خواہشوں سے کافی حد تک آزاد ہوجاتا ہے۔ اس کا نفس اس کی ذاتی شخصیت اور عادت کے زیر اثر نہیں رہتا۔ دوسرے لفظوں میں ذاتی شخصیت، مزاج اور نفسانی خواہشات کے اثرات سے دُور ہونے کا نام یقین ہے۔ یقین حاصل کرنے کے بعد انسان عام لوگوں کی طرح نہیں رہتا۔ یہ دُنیا اور جو کچھ بھی اس دُنیا سے مربوط ہے ان سب کو وہ کوئی اہمیت نہیں دیتا اور سب کو عملی طور پر ناقابلِ اعتنار سمجھتا ہے۔ اس کی زندگی کا ایک ایک عمل اس امر کی گواہی دیتا ہے۔

حضرت علی علیہ السلام نے ہمّام کو متقین کی صفات بتلاتے ہوئے

اپنے ماننے والوں کو بڑے اچھے انداز میں یہ تصویر دکھائی ہے ۔ آپ نے متقین کے یقین کے بارے میں جو کچھ فرمایا ہے اس میں یہ بھی ہے وَھُمۡ وَالجنۃ کمن قد راٰھا فھُم فیھا منعمون وَھم النار کمن راھا فھُم فیھَا معذبون ۔ یعنی "ان کو جنّت کا ایسا ہی یقین ہے جیسے کسی کو آنکھوں دیکھی چیز کا ہوتا ہے تو گویا وہ اسی وقت جنّت کی نعمتوں سے بہرہ مند ہیں اور دوزخ کا بھی ایسا ہی یقین ہے جیسے وہ دیکھ رہے ہیں اور انہیں یوں محسوس ہوتا ہے کہ جیسے وہاں کا عذاب ان کے گرد پیش موجود ہے ۔"

اس دور کے اہلِ یقین

سچ ہے عظیم اور ہر دلعزیز شخصیت کے مالک عظیم مجاہد حضرت آیتہ اللہ سید عبدالحسین دستغیب شہید اس زمانے میں اہلِ یقین کی شاندار مثال ہیں ۔ یہ ایسے ممتاز صاحب یقین ہیں جن سے بہت سے لوگوں نے فیض حاصل کیا اور کسی حد تک منزل یقین تک رسائی بھی حاصل کی ۔

یہ کتاب اِسی صاحبِ یقین مردِ مومن کی تقریروں اور تحریروں کا مجموعہ ہے ۔ آپ ان اوراق پر اس عظیم عالمِ دین میں موجود یقین کے آثار کا مطالعہ فرمائیں گے اور ہو سکتا ہے کہ اس کتاب کے محترم پڑھنے والوں میں بھی ایسے ہی آثار پیدا ہو جائیں ۔

آخر میں میں جناب اسماعیل شفیعی کا شکر گزار ہوں جنہوں نے اس کتاب کے علمی نکات جمع کرنے میں زحمت اُٹھائی۔ اور اس کتاب کی نشر و اشاعت میں جن لوگوں نے ہاتھ بٹایا ان سب کا تہہ دل سے ممنون ہوں۔ امید ہے کہ خداوند عالم ان سب کو جزائے خیر عطا فرمائے اور زیادہ سے زیادہ اسلام اور جمہوریۂ اسلامی ایران کی خدمت کرنے کی توفیق عطا فرمائے گا۔ بمنّہ و کرمہٖ

دسمبر ۱۹۸۳ء

شہید محراب حضرت آیتہ اللہ دستِ غیب کی دوسری برسی کے موقع پر

سیّد محمّد ہاشم دستغیب، شیراز

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مقدمہ

از : شفیعی

الحمدُ للہِ ربّ العالمین

دلیل اور علم کے ذریعے کسی نتیجے تک رسائی حاصل کرنے والوں کی صرف ظاہری آنکھوں سے پردہ ہٹتا ہے اور اصل معرفت تک پہنچنے کی راہ میں بہت سی رکاوٹیں باقی رہ جاتی ہیں۔ صرف اپنے علمی سرمائے پر بھروسہ کرنے والا اس بات سے غافل رہتا ہے کہ اُس کا یہ علمی سرمایہ خداوندِ لم یزل ولایزال کی یاد کے بغیر رہنمائی حاصل کرنے کے لئے کافی نہیں ہے۔ بلکہ بغیر یادِ خدا کے علم تو ایک ایسا حجاب ثابت ہوتا ہے جس پر بھروسہ کر لینا راہ سے بھٹکا دینے کا باعث ہوتا ہے۔

اسی لئے تو کہا گیا ہے "اَلعِلمُ حِجَابُ الاَکبَر" یعنی "علم سب سے بڑا حجاب اور رکاوٹ ہے!" علم ان لوگوں کے لئے حجاب ثابت ہوتا ہے جو یہ سمجھ بیٹھتے ہیں کہ ہم اُسی کے ذریعے حقیقت تک رسائی حاصل کر سکتے ہیں۔ اس سے بھی بڑھ کر اُن لوگوں کے لئے علم بُرا ثابت ہوتا ہے جو یہ سوچ

لیتے ہیں کہ ہماری غرض و غایت صرف یہی علم ہے اور اسی کے ذریعے ہم بنی نوع انسان کے تمام مسائل حل کر سکتے ہیں۔ یہ سوچ لینا گمراہی کے علاوہ کچھ اور نہیں ہے۔ آج یہ باور کرنے کی کوشش کی جارہی ہے کہ ہمارے تمام معاشرتی اور ثقافتی مسائل کا حل علم اور صرف علم ہے۔ علم ہی کے ذریعے ہم اپنی تمام مشکلات کی اُلجھی ہوئی گتھیوں کو سلجھا سکتے ہیں۔ حد تو یہ ہے کہ بعض مغرب کے دل دادہ افراد مغربی تعلیم اور وہاں پر موجود عدالتی نظام کو ہی اپنا اصل مقصد قرار دیتے ہیں۔ ان کی تمام تر کوشش یہی ہوتی ہے کہ وہ اپنا تمام تعلیمی اور عدالتی نظام مغربی طرز پر ہی استوار کریں۔

اللہ تعالیٰ نے انسان کو تمام موجوداتِ عالم اور اس کے نظام میں غور و فکر کرنے کی دعوت دی ہے۔ معصومین علیہم السّلام نے بھی اسی کی جانب رغبت دلائی ہے۔ حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں کہ انسان کو چاہیئے کہ وہ بیداری قلب کے ساتھ غور و فکر کرے۔ رات میں خداوند عالم سے راز و نیاز کی باتیں کرے اور اپنے پروردگار کی جانب دل سے مائل ہو۔ امام جعفر صادق علیہ السلام، خداوند عالم اور اس کی قدرت کے بارے میں ہمیشہ سوچتے رہنے کو بہترین عبادت قرار دیتے ہیں تاکہ انسان بڑے سے بڑا عالم بھی بن جانے کے باوجود خداوند متعال کے ہر شئ پر احاطۂ علمی رکھنے اور ذرّے ذرّے پر قدرت کاملہ رکھنے کے خیال سے کبھی غافل نہ ہو۔ اور وہ دنیا کی تمام چیزوں کو حق سبحانہٗ تعالیٰ کی قدرت کاملہ کا وسیلہ سمجھے۔

ربّ العزت نے انسان کو زیادہ سے زیادہ کمال اور بلندی عطا کرنے

کے لئے اچھے اخلاق سے آراستہ ہونے کی دعوت دی ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ انسان بہترین سمجھ بوجھ پیدا کرے۔ اپنے کو برائیوں سے بچائے۔ صبر و تحمّل سے آراستہ ہو۔ سچّا اور باوفا بنے۔ انہی امور کا خیال رکھتے ہوئے وہ فلاح حاصل کرلیتا ہے۔

یہاں یہ جان لینا بھی ضروری ہے کہ صرف علم اور زبانی طور پر توحید کا اقرار کرلینا اسلام میں کافی نہیں ہے بلکہ انسان کو چاہیئے کہ وہ اپنے آپ کو اچھی صفات سے آراستہ کرے اور اپنے باطن کو شکوک و شبہات کی آلودگیوں سے پاک و پاکیزہ بنائے۔ اسلام کو دل کی گہرائیوں سے قبول کرے یہاں تک کہ بتدریج علم الیقین تک پہنچے اور پھر حق الیقین تک رسائی حاصل کرلے۔

خداوند متعال کے فضل و کرم سے ہمیں معلّم اخلاق شہید آیت اللہ سید عبدالحسین دستِ غیب کے تیسرے علمی سرمائے کو جمع کرنے کی سعادت حاصل ہوئی۔ خداوند متعال ہماری سعی کو قبول فرمائے۔

اس کتاب کی ترتیب اور تنظیم میں جو کمی بیشی رہ گئی ہے ہم اس کی معذرت چاہتے ہیں۔

شفیعی

۵/ جولائی ۱۹۸۳ء

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

فصل ۔ ۱

معرفتِ قلبی

اوّل الدّین معرفتہ

یعنی دین کی ابتداء اللہ تعالیٰ کی دل سے معرفت حاصل کرنا ہے۔

قَالَتِ الْاَعْرَابُ اٰمَنَّا ؕ قُلْ لَّمْ تُؤْمِنُوْا وَ لٰكِنْ قُوْلُوْٓا اَسْلَمْنَا وَ لَمَّا يَدْخُلِ الْاِيْمَانُ فِيْ قُلُوْبِكُمْ ؕ

یعنی: "صحرانشین عرب کہتے ہیں کہ ہم ایمان لے آئے (اے رسولؐ کہدو کہ تم ایمان نہیں لائے بلکہ (یوں) کہو کہ اسلام لائے حالانکہ ایمان کا تو ابھی تک تمہارے دلوں میں گزر ہی نہیں ہوا" (سورۂ حجرات: آیت ۱۴)

اور سورۂ بقر کی آیت ۱۳۲ میں ارشاد ہوا۔ اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰى لَكُمُ الدِّيْنَ فَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَ اَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ ۝

"بے شک اللہ تعالیٰ نے تمہارے واسطے دین (اسلام) کو پسند فرمایا ہے۔ پس تم ہرگز نہ مرنا مگر مسلمان ہی ہو کر"

مذکورہ آیتوں کی روشنی میں واضح ہو جاتا ہے کہ مسلمان کے لئے صرف اپنے پروردگار کی ابتدائی معرفت رکھنا کافی نہیں ہے۔

اصطلاحی اعتبار سے عام معنوں میں یہ اسلام ہے انسان کو چاہیئے کہ معرفت قلبی حاصل کرے اور دل کی گہرائی سے خدا کی وحدانیت کا قائل ہو اور اس کی صفات پر یقین کامل رکھے تو یہ خاص معنوں میں اسلام کہلائے گا۔

جیسا کہ سورۂ حجرات میں ذکر ہوا بعض بدو اللہ تعالیٰ کی حقیقی معرفت سے ناآشنا تھے اور محض ظاہری اسلام کے شیدائی تھے۔ مگر اس بات کے دعویدار تھے کہ ہم ایمان لے آئے ہیں لیکن آیت نے واضح کر دیا کہ ایسا ظاہری ایمان تمہیں منزل کمال تک نہیں پہنچا سکتا۔ البتہ یہ اور بات ہے کہ ظاہری ایمان باطنی ایمان کی معرفت کے لئے ایک ذریعہ ثابت ہو۔ صرف دلیلوں کے سہارے سے اجمالی معرفت حاصل کر لینا محض اس کے احکام کو تسلیم کر لینے کا نام ہے۔

اول الدین معرفتہ یعنی دین کی ابتدا اللہ کی معرفت کا حصول ہے پھر وکمال معرفتہ التصدیق بہ یعنی کمال معرفت یہ ہے کہ دل سے اس کی تصدیق کی جائے۔" آپ کے دلوں میں ایمان راسخ ہونا چاہیئے۔ دل سے حق کی تصدیق کرنا لازمی ہے۔ خضوع وخشوع کے ساتھ اطاعتِ پروردگار کا جذبہ پیدا ہونا چاہیئے۔ دل میں ایمان پیدا کرنے کے لئے ضروری ہے کہ نفس میں پائی جانے والی رکاوٹوں کو دور کیا جائے۔ جب تک آدمی خود پسند ہے اس میں خضوع وخشوع کیسے پیدا ہو سکتا ہے؟ اور جب تک کوئی شخص اپنے آپ کو مستقل حیثیت دیتا ہے۔ وہ اپنے پروردگار کو دل کی آنکھوں سے کیسے دیکھ سکتا ہے؟ اور اس کے دل میں موجود

شکوک و شبہات کیسے دور ہو سکتے ہیں؟ وہ کیوں کر سمجھ سکتا ہے کہ اس کائنات میں اس کا وجود ذاتِ واجب الوجود ہی کی وجہ سے ہے۔

یعنی وہ "ممکن الوجود" ہے۔ خود پسند یہ کبھی ماننے کو تیار نہیں ہوتا کہ اس کا تمام وجود اور اس کی زندگی کے سارے اجزاء اور اس کی تمام حرکات و سکنات غرض یہ کہ سب کچھ لطفِ الٰہی کا محتاج ہے۔ صرف واجب الوجود ہی عین ذات ہے اور وہی اصلِ وجود ہے۔ اس کے علاوہ کائنات کی تمام چیزیں اپنے طور پر کوئی حیثیت نہیں رکھتیں۔ ہر چیز اس کی ذات سے وابستہ ہے۔ جو شخص اس حقیقت سے ناواقف ہو اور اپنے آپ کو ایک مستقل وجود کی حیثیت دیتا ہو اور اپنی ہی ذات کو سب کچھ سمجھتا ہو وہ بھلا اللہ تعالیٰ کی سچی معرفت کیسے حاصل کر سکتا ہے؟

خود پسندی کا علاج

خود پسندی کا علاج ضروری ہے اس خام خیالی کو اپنے ذہن سے نکال دینا چاہیئے کہ آدمی کا اپنا وجود کوئی مستقل وجود رکھتا ہے۔ اپنی ذات کو پسند کر لینا اور خود پسندی میں مبتلا ہو جانا آخر کس لئے؟ ذرا کوشش کیجیئے اور سوچیئے کہ "میں" کیا ہے؟ میں نہ تو خود اپنی مرضی سے یہاں آیا ہوں اور نہ ہی اپنی مرضی سے اس دنیا سے جاؤں گا۔ اور نہ ہی اپنی مرضی کے مطابق یہاں رہ سکتا ہوں۔ مجھے تو اپنے بدن کے نظام سے متعلق بھی آگاہی نہیں ہے

تو پھر آخر یہ "میں میں" کی پکار کیسی؟

کیا اپنے آپ کو فائدہ اور نقصان پہنچانا ہمارے اپنے اختیار میں ہے زندہ رہنا یا مرجانا ہمارے اپنے بس میں ہے۔ کیا ہم خود کو طاقت ور یا کمزور رکھ سکتے ہیں؟ اور کیا یہ ممکن ہے کہ ہم ہمیشہ اپنے آپ کو جوان اور صحت مند رکھ سکیں؟ کیا یہ ممکن ہے کہ ہم اپنے سر کے بالوں کو سفید ہونے سے روک دیں اور موت نہ آنے دیں؟ ہمیں یہ بات سمجھ لینا چاہیئے کہ ہم ذاتی طور پر محتاج اور عاجز ہیں۔ اے لوگو! تم ہمیشہ اپنے پروردگار کے محتاج ہو۔ تمہاری زندگی کا ایک ایک پل اسی کا محتاج ہے۔ قوت و طاقت، سمجھ بوجھ اور زندگی جس کی بدولت ہم بہت کچھ کر سکتے ہیں، یہ سبھی چیزیں بذاتِ خود احتیاج رکھتی ہیں یعنی ہمارا وجود "ممکن الوجود" ہے۔ اپنے ممکن الوجود ہونے کو یقینی طور پر مان لینا چاہیئے تاکہ ہر بات میں "میں میں" کہنے کا خاتمہ ہو جائے اور یہ "میں" کا پردہ ہٹ جائے۔ غور و فکر اور عمل کے ذریعے خود پسندی کے علاج کی طرف توجہ دینی چاہیئے۔ اس طرح اپنے نفس کو معنوی اور روحانی غذا فراہم کرنا چاہیئے۔ لاپرواہی اور ہر طرح کی حدود و قیود سے آزادی کے باعث نفس پر ایک طرح کا پردہ پڑ جاتا ہے اور یہ پردہ حق و معرفت کی راہ میں رکاوٹ ثابت ہوتا ہے۔

استعداد کے مطابق معرفت

"وکمال معرفتہ التصدیق بہ" یعنی! "کمال معرفت یہ ہے کہ دل سے اسکی تصدیق کی جائے"۔ ایمانِ قلبی اور دل سے معرفتِ پروردگار کی کیفیت اچانک

نہیں پیدا ہوتی۔ علم و یقین جس کا لازمی نتیجہ خضوع و خشوعِ پروردگار ہے۔ یک بہ یک ظاہر نہیں ہوتے۔ اسی طرح معرفتِ پروردگار کی کوئی خاص حد معین نہیں ہے۔ جس طرح خداوندِ متعال لامحدود ہے۔ اُسی طرح اس کی معرفت حاصل کرنے کی بھی کوئی حد معین نہیں۔ ہر وہ شخص جو اپنی استعداد کے مطابق خداداد صلاحیتوں سے معرفت حاصل کرنے کی کوشش کرتا رہے گا۔ اُس کے یقین میں روز بروز اضافہ ہوتا چلا جائے گا۔ سب سے پہلے علم کے درجے طے کرنے کی ضرورت ہے اس کیلئے نفس کی ریاضت درکار ہے۔ خدا کے سامنے عجز و انکساری لازمی ہے۔ خداوندِ متعال کی عنایت و توفیق ہی سے انسان اپنے نفس کو ریاضت کی طرف مائل کر سکتا ہے۔ نفس کو ریاضت کی طرف مائل کرنیکا مطلب اپنی ذاتی خواہشات کے مطابق کم سے کم عمل کرنا ہے۔

جب انسان علم حاصل کرلے تو اسے یہیں پر رُک نہیں جانا چاہیئے کیونکہ معرفت کی راہ میں پایا جانے والا پردہ ابھی ہٹا نہیں ہے بلکہ ذرا ہلکا ہوگیا ہے۔ اس حجاب کو ختم کرنے کے لئے ابھی اور بھی منزلیں طے کرنا ہیں۔

ایک روایت میں ہے کہ بندے اور اس کے پروردگار کے درمیان ستر ہزار تاریکیوں کے پردے اور ستر ہزار نور کے پردے پائے جاتے ہیں البتہ یہ وہ باتیں ہیں جو ہماری سمجھ سے بالاتر ہیں۔ اُنگلیوں پر گنے جانے والی چند ہستیوں کے سوا ایسی باتیں دوسرے نہیں سمجھ سکتے۔ جب انسان علم حاصل کرلیتا ہے تو تاریکیوں کے بعض پردے ہٹ جاتے ہیں۔ البتہ اس کا مطلب یہ نہیں کہ یکسر تمام پردے اُٹھ گئے۔

کیا علم حجابِ اکبر ہے؟

بعض بزرگ فرماتے ہیں: العلم حجاب الاکبر یعنی "علم سب سے بڑا پردہ ہے۔" اچھی طرح غور کر لینا چاہیئے کہ اس جملے کے کہنے والوں نے علم کی کوئی خدمت نہیں کی ہے۔ بلکہ انہوں نے تو اُسے معرفت کی راہ میں پردے کو اور رکاوٹ ثابت کرنے کی بات کی ہے۔ مگر یہ بات تو اس وقت درست ہوگی جب آدمی اپنے جمع شدہ علمی سرمایہ کو اپنی ذاتی کوششوں کا نتیجہ سمجھے، اسی علمی سرمایہ پر بھروسہ کرتے ہوئے کسی بات کی حقیقت تک رسائی حاصل کرے اور یہ سمجھ بیٹھے کہ جو کچھ اُس نے سمجھا ہے وہ اُسی کی اپنی ذات ہی کی طرف سے ہے۔ یا اس سے بھی بڑھ کر نعوذ باللہ علم حاصل کر لینے کے بعد وہ خود کو دوسروں سے برتر سمجھنے لگے۔ مختصر یہ کہ جب آدمی اپنے علم کو محض اپنی ذاتی کوشش ہی کا نتیجہ سمجھنے لگے تو اس پر غرور و تکبّر اور خام خیالی کا پردہ پڑ جاتا ہے۔ یہی وہ مقام ہے جس کی مناسبت سے علم کو حجاب اکبر قرار دیا گیا ہے۔ کیونکہ ممکن ہے انسان غفلت کی تہوں کو ہٹانے کی کوشش کرے اس لئے کہ وہ ان کی جانب متوجّہ ہوتا ہے۔ لیکن جب خود علم حجاب کی صورت رکاوٹ بن جائے تو وہ اس کو ہٹانے کی جانب متوجہ ہی نہیں ہو پاتا۔ پھر بھلا وہ اسے کیوں کر ہٹا سکتا ہے۔ اسی مناسبت سے بعض بزرگوں نے علم کو حجاب اکبر قرار دیا ہے۔ یہی وہ موقع ہے جہاں اگر لطف و کرم پروردگار شاملِ حال نہ

ہو تو انسان اپنی نجات کا سامان نہیں حاصل کر سکتا۔

برا آدمی وہ ہے جو گناہ کرے، گناہ کے راستے کو نہ چھوڑے اور توبہ نہ کرے ایسے شخص پر پردہ پڑا ہوا ہے اور وہ اُسے ہٹانے کی فکر میں نہیں ہے اور اس سے بھی بدتر وہ ہے جو گناہ کرنے کے باوجود خود کو گنہ گار نہ سمجھے اور اُسے یہ تک معلوم نہ ہو کہ وہ گناہوں میں ڈھنسا ہوا ہے۔ ظاہر ہے کہ پہلے شخص کی نجات کے سلسلے میں اُمید کی جا سکتی ہے۔ اور دوسرے شخص کے بارے میں نجات کی کوئی امید نہیں۔ البتہ یہ اور بات ہے کہ پروردگار کا فضل و کرم اس کے شاملِ حال ہو جائے۔ دوسرے لفظوں میں پہلا شخص جہلِ بسیط میں مبتلا ہے جب کہ دوسرا شخص جہلِ مرکب کا شکار ہے۔

بصارتِ قلبی

انسان کو چاہیئے کہ وہ علم حاصل کرنے کے بعد اسی پر اکتفا نہ کرے بلکہ آگے کے مراحل طے کرنے کی کوشش کرتا رہے۔ یعنی علم سے علم الیقین تک اور پھر عین الیقین تک رسائی حاصل کرے۔ اسی کا نام بصارتِ قلبی ہے۔ یہاں تک پہنچنے کے بعد بھی جد و جہد کا سلسلہ جاری رکھتے ہوئے آگے بڑھتے رہنا چاہیئے۔ سورۂ طٰہٰ کی آیت ۱۱۴ میں خداوند عالم اپنے حبیب حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو یہ حکم دے رہا ہے۔

قُلْ رَبِّ زِدْنِیْ عِلْمًا ط یعنی (اے رسول) کہدو کہ اے میرے

پالنے والے میرے علم میں اضافہ فرما۔"

یہاں پر یہ بات بھی اچھی طرح ذہن نشین کرلینی چاہیئے کہ ہر صاحبِ علم سے بڑھ کر ایک اور صاحب علم ہے۔ جیسا کہ سورۂ یوسف کو آیت ۷۶ میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے کہ وَفَوْقَ كُلِّ ذِي عِلْمٍ عَلِيمٌ ط پھر جب انسان عین الیقین تک پہنچ جائے تو حق الیقین کی منزل تک رسائی حاصل کرنے کی سعی کرے۔ یہ وہ منزل ہے جسے لفظوں میں بیان نہیں کیا جاسکتا۔ یہ قلب کی ایک خاص کیفیت ہے جو محسوسات سے ماوراء ہے۔

محقق طوسیؒ نے علم و معرفت کے ان مراحل کو سمجھانے کے لئے ایک مثال دی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ آپ اگر دُور سے دھواں اٹھتا ہوا دیکھیں تو آپ کو علم حاصل ہو جائے گا کہ وہاں آگ ہے اور جب آپ اپنی آنکھوں سے آگ دیکھ لیں تو یہ "علم الیقین" ہے۔ پھر جب آپ اور قریب ہو کر خوب اچھی طرح آگ کا مشاہدہ کرلیں تو اسے "عین الیقین" کہا جائیگا اور جب آپ آگ کے اتنے قریب ہو جائیں کہ حرارت محسوس ہونے لگے اور آپ کا جسم جلنے لگے تو یہ حق الیقین کی منزل ہے۔

معلوم ہوا کہ علم کی ابتدائی منزل پر پہنچ کر رکنا نہیں چاہیئے بلکہ علم کی انتہائی منزل تک پہنچنے کی کوشش جاری رکھنا چاہیئے۔ قرآن مجید نے اسی کا حکم دیا ہے فَاعْلَمْ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ سورۂ محمد آیت ۱۹ یعنی "خوب سمجھ لو کہ اللہ کے علاوہ کوئی اور خدا نہیں ہے۔" مطلب یہ کہ علم کی اس منزل تک پہنچ کر معرفتِ پروردگار حاصل کرو کہ جہاں کسی قسم

کا شک و شبہ باقی نہ رہے اور ایسا اطمینان قلب حاصل ہو کہ اگر روئے زمین پر صرف تمہارے علاوہ کوئی اور توحید کا قائل نہ رہے پھر بھی تم ذرہ برابر بھی مضطرب نہ ہو۔

ہمیں یقین کا مطلب خوب اچھی طرح سمجھ لینا چاہیئے۔ یہ یقین ہی ہے جو انسان کو بلند مرتبہ عطا کرتا ہے۔ یہ یقین ہی ہے جس کی تمنا بزرگ ہستیاں کیا کرتی ہیں۔ یہ یقین تو ایک ایسا نور ہے کہ جب اللہ تعالیٰ انسان کو عطا فرما دیتا ہے تو اس کا دل جلوہ زار بن جاتا ہے اور اس پر حقائق روشن ہونے لگتے ہیں۔ اس کا یقین اتنا محکم ہو جاتا ہے کہ اگر اسے سینکڑوں شکوک و شبہات کا سامنا بھی کرنا پڑے تب بھی اس پر کوئی منفی اثر نہیں ہوگا۔ اس کی مثال تو بس اس شخص کے مانند ہے جو دور سے آگ کے شعلے دیکھ کر یہ یقین کر لے کہ وہاں آگ ہے اور اب کوئی بھی چیز اُسے اس یقین سے نہیں ہٹا سکتی۔

یقین کے مطابق عمل

ظاہر ہے کہ عمل بھی یقین کے مطابق ہونا چاہیئے۔ ایک آدمی دور سے دیکھتا ہے کہ اس کے گھر سے دھواں اُٹھ رہا ہے اور آگ کے شعلے بھڑک رہے ہیں۔ اب اسے یقین ہو جاتا ہے کہ یہ آگ گھر میں موجود مال و اسباب کو جلا کر خاکستر کر دے گی تو اسے لازمی طور پر اس آگ کو بجھانے

کے لئے تیزی سے اقدام کرنا چاہیئے۔ اگر وہ ایسا نہیں کرتا ہے تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ اس پر غفلت کا پردہ پڑا ہوا ہے۔ اسی وہم کی وجہ سے وہ کوئی اقدام نہیں کر رہا ہے۔

وہم کا غلبہ

کبھی کبھار یقین پر وہم غالب آجاتا ہے۔ مثلاً آدمی کو یقین ہے کہ مردہ کسی قسم کی کوئی حرکت نہیں کر سکتا۔ لیکن جب تک ایک آدمی زندہ تھا اس سے کسی قسم کا کوئی خوف نہیں تھا لیکن جب وہ مر گیا تو اس سے خوف محسوس ہونے لگا! آخر کیوں؟ معلوم یہ ہوا کہ یقین پر وہم غالب آچکا ہے عقل مغلوب ہو چکی ہے اور اب وہ اس یقین کے مطابق جس کا لازمہ مردے سے نہ ڈرنا تھا عمل کرنے سے قاصر ہو گیا ہے۔ دعائے ابوحمزہ ثمالی کے آخر میں جس "یقیناً صادقاً" کی استدعا کی جارہی ہے شاید اس سے ایسا سچا یقین مراد ہو جو اپنے تمام آثار و لوازم سے کبھی جدا ہونے والا نہ ہو۔

صفاتِ الٰہی پر یقین

جب انسان اللہ تعالیٰ کی صفات پر کامل یقین رکھتا ہو تو اس کے لازمے کو بھی ماننا چاہیئے اور اس کے مطابق عمل ہونا ضروری ہے۔ مثلاً جب اس بات پر یقین رکھے کہ خدا ہر چیز سے آگاہ ہے، وہ ہر جگہ موجود

ہے۔ ہمیشہ رہے گا اور بندوں کے تمام اعمال کو دیکھتا ہے تو اب ایسے یقین کا لازمی نتیجہ یہ ہونا چاہیئے کہ بندہ خود کو خدا کے سامنے محسوس کرتے ہوئے اس سے شرم کرے اور اس کی بندگی کے تقاضے چھوڑ کر کوئی بھی خلافِ ادب کام نہ کرے۔

اسی طرح جب خدا کے قادرِ مطلق ہونے پر یقین رکھتا ہو تو اسے لازمی طور پر اسی کی ذات پر توکل کرنا چاہیے اور اس کے علاوہ کسی اور سے نہیں ڈرنا چاہیئے۔

چنانچہ جب خدا کی رزّاقیت پر یقین رکھتا ہو تو اب اسے کبھی بھی روزی کے سلسلے میں غمگین نہیں ہونا چاہیئے۔

اور اسی طرح جب آدمی اس بات پر یقین رکھتا ہو کہ کائنات کے تمام امور اس کے معین شدہ فیصلے کے مطابق ہوتے ہیں اور اس کا کوئی بھی کام حکمت اور بندوں کی مصلحت سے خالی نہیں ہوتا، تو اُسے ہمیشہ پیکرِ صبر و رضا اور خدا کے ہر امر کو تسلیم کرنے والا ہونا چاہیئے۔ یہی نہیں بلکہ اُسے اپنے تمام امور خدا کے سپرد کر دینے چاہئیں اور ہمیشہ لالچ اور بخل سے دُور رہنا چاہیئے۔ اس کے علاوہ خدا کی جتنی بھی صفات پر یقین رکھتا ہو ان کے مطابق لازمی طور پر ان سے مثبت اثر لینا چاہیئے۔ دیگر بعض صفات کا ہم آگے چل کر مختصراً ذکر کریں گے۔ یہ یقین تو درحقیقت ایک نور ہے جو خداوندِ عالم بندے کے دل میں پیدا کر دیتا ہے۔

نورِ یقین

ایسے ہی نورِ یقین کا تذکرہ قرآن مجید نے متعدد مقامات پر کیا ہے۔ ان میں سے چند یہ ہیں۔

اَفَمَنْ شَرَحَ اللّٰهُ صَدْرَهٗ لِلْاِسْلَامِ فَهُوَ عَلٰى نُوْرٍ مِّنْ رَّبِّهٖ ؕ

(سورۂ زمر ۳۹ : آیت ۲۲)

"تو کیا وہ شخص جس کے سینہ کو خدا نے (قبولِ حق) کے لئے کشادہ کر دیا ہے اور جو اپنے پروردگار (کی ہدایت) کی روشنی پر (چلتا) ہے وہ گمراہوں کے برابر ہو سکتا ہے؟"

اَوَمَنْ كَانَ مَيْتًا فَاَحْيَيْنٰهُ وَجَعَلْنَا لَهٗ نُوْرًا يَّمْشِيْ بِهٖ فِي النَّاسِ كَمَنْ مَّثَلُهٗ فِي الظُّلُمٰتِ لَيْسَ بِخَارِجٍ مِّنْهَا سورۂ انعام ۶ آیت ۱۲۳

"کیا جو شخص (پہلے) مردہ تھا پھر ہم نے اس کو زندہ کیا اور اس کیلئے ایک نور بنایا جس کے ذریعہ سے وہ لوگوں میں (بے تکلف) چلتا پھرتا ہے اس شخص کی طرح ہو سکتا ہے جس کی حالت یہ ہو کہ (ہر طرف سے) اندھیروں میں (پھنسا ہوا ہے) کہ وہاں سے کسی طرح نکل نہیں سکتا۔"

فَمَنْ يُّرِدِ اللّٰهُ اَنْ يَّهْدِيَهٗ يَشْرَحْ صَدْرَهٗ لِلْاِسْلَامِ ۚ وَمَنْ يُّرِدْ اَنْ يُّضِلَّهٗ يَجْعَلْ صَدْرَهٗ ضَيِّقًا حَرَجًا كَاَنَّمَا يَصَّعَّدُ فِي السَّمَآءِ ؕ كَذٰلِكَ يَجْعَلُ اللّٰهُ الرِّجْسَ عَلَى الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ

(سورۂ انعام ۶ آیت ۱۲۵)

"خدا جس کو راہِ راست دکھانا چاہتا ہے اس کے سینے کو اسلام (کی ودلیت) کے واسطے (صاف اور) کشادہ کر دیتا ہے اور جس کو گمراہی کی حالت میں چھوڑنا چاہتا ہے اس کے سینے کو تنگ اور دشوار کر دیتا ہے گویا (قبولِ ایمان) اس کے لئے آسمان پر چڑھنا ہے، جو لوگ ایمان نہیں لاتے خدا ان پر بُرائی کو اسی طرح مسلّط کر دیتا ہے۔"

جب یہ آیت نازل ہوئی تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے اصحاب نے پوچھا "یَشْرَحْ صَدْرَہٗ" سے کیا مراد ہے؟ آپ نے فرمایا اس سے مراد ایسا نورِ (یقین) ہے جو خداوند عالم اپنے بندے کے دل میں ڈال دیتا ہے۔ چنانچہ اس کے قلب میں وسعت پیدا ہو جاتی ہے اور بآسانی حق کو قبول کر لیتا ہے۔

لوگوں نے پوچھا کیا اُس نورِ یقین کی کوئی پہچان بھی ہے؟ حضورِ اکرم نے ارشاد فرمایا۔ ہاں، کیوں نہیں، اس نور کی پہچان، ہمیشہ آخرت کو یاد رکھنا، دنیا کی محبت کو دل میں جگہ نہ دینا اور اپنی موت سے پہلے سفرِ آخرت کا اچھی طرح انتظام کر لینا ہے۔ (یعنی توبہ اور خلوصِ نیّت سے عمل کرنے کے سلسلے میں لگے رہنا۔)

نبوّت پر یقین

اس بات پر یقین رکھنے کے بعد کہ خداوند متعال نے اس کائنات میں کوئی بھی چیز بغیر مصلحت کے نہیں پیدا کی ہے اور ہر

شئے کی خلقت کا کوئی نہ کوئی مقصد ضرور ہے۔ انسان کو خوب اچھی طرح غور و فکر کرنا چاہیئے۔ اسے سوچنا چاہیئے کہ اگر انسان کی خلقت کا مقصد صرف یہی ہو کہ وہ خاک سے خلق ہو اور پھر اسی خاک میں مل جائے گا تو ایسی خلقت عبث اور بے کار ہو کر رہ جائے گی۔ بلکہ یہ تو انسان پر بڑا ظلم ہوگا! کیونکہ آدمی اس دنیا میں طرح طرح کی سختیوں اور تکلیفوں کا شکار ہوتا ہے اور یہ بات ہم اپنی پچھلی بحثوں میں بتا چکے ہیں۔ لہٰذا عقلی طور پر یہ واضح ہو جاتا ہے کہ انسان کو حیاتِ جاودانی عطا کی گئی ہے اور موت، فنا ہو جانے کا نام نہیں ہے۔ مرنے کے بعد اُسے عالمِ آخرت میں ہمیشہ رہنا ہوگا۔ اس عالم آخرت میں ہر انسان کو پورا پورا بدلہ دیا جائے گا۔ اور یوں اس دنیا میں اچھے کام کرنے والوں کو سعادتِ ابدی حاصل ہوگی۔

سعادتِ ابدی کیا ہے؟ اس تک پہنچنے کا راستہ کون سا ہے؟ اسے واضح کرنے کے لئے ضروری ہے کہ خداوند لطیف و کریم اپنے بندوں میں سے کسی ایک کو اس سے آگاہ فرمادے۔ پھر وہ خاص بندہ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ سے علم پانے کے بعد دوسرے تمام بندوں کی رہنمائی کرے۔ اور ساتھ ہی ساتھ خداوند متعال بنی نوع انسان کے لئے مکمل ضابطۂ حیات وضع کر کے اپنے اس خاص بندے کے حوالے کردے تاکہ وہ اس کے ذریعے لوگوں پر اللہ کی حکومت قائم کرے۔ اور یہ بھی ضروری ہے کہ خداوند عالم اپنے اُس خاص بندے کو ایسی نشانی بھی عطا فرمائے جس سے دوسرے لوگوں کو اس کی صداقت پر یقین حاصل ہو۔ یعنی وہ صاحب معجزہ ہو۔ اور اُس

بندے کا اپنے پروردگار کی لامتناہی قدرت سے ایسا خاص ربط ہو جبکہ خدا سے ایسا ربط و تعلق قائم کرنے سے دوسرے تمام بندے عاجز ہوں۔

مذکورہ تفصیلات اور قرآن مجید (جو کہ ایک معجزہ ہے) کی طرف رجوع کرنے سے یہ یقینی طور پر واضح ہو جاتا ہے کہ حضرت محمد ابن عبد اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اللہ کے رسول ہیں۔ آپؐ نے جو کچھ فرمایا ہے وہ سب بالکل سچ ہے۔ آپ کے ہر حکم کی اطاعت واجب ہے۔

قرآن مجید اور احادیث متواترہ قطعیہ کی روشنی میں ثابت ہے کہ آپؐ آخری پیغمبر ہیں اور اب آپؐ کے بعد کوئی نبی نہیں آئے گا۔ بنی نوع انسان کو قیامت تک جن امور کو جاننے کی ضرورت ہے وہ سب کے سب آنحضرتؐ نے بیان فرمایا ہے۔ آپؐ کی ختم نبوت پر یقین اس امر کا تقاضا کرتا ہے کہ اب اگر کوئی بھی شخص دعویٰ نبوت کرے اور کہے کہ مجھ پر خدا کی طرف سے وحی نازل ہوتی ہے تو اسے ہرگز قبول نہ کیا جائے اور اس بات پر یقین رکھنا چاہیئے کہ ایسے شخص کا دعویٰ سراسر باطل اور جھوٹ ہے خواہ ایسا شخص شعبدے دکھا کر یا عجیب و غریب علوم سیکھ کر حیرت انگیز کام ہی کیوں نہ کر دکھائے اور خواہ وہ اپنے باطل علوم کے بل بوتے پر غیب ہی کی خبریں کیوں نہ دے۔ بہر حال اس بات پر یقین رکھنا چاہیئے کہ اس کا یہ کرتب سحر ہے۔ نیرنگ ہے اور شیطان کی طرف سے ہے۔ نیز اگر آدمی طاقت رکھتا ہو تو فتنہ و فساد ختم کرنے کے لئے نبوت کے جھوٹے دعویدار کو قتل کر دینا واجب ہے۔

اہلِ یقین کی پہچان

حضور اکرم حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم اہلِ یقین کی پہچان بتلاتے ہوئے ارشاد فرماتے ہیں:

لاتجلسوا عند کلِّ عالمٍ الا عالم یدعوکم مِنَ الخمس الی الخمس ط یعنی "تم ہر قسم کے عالم کے پاس نہ بیٹھو. بس! ایسے عالم کے قریب رہو جو تمہیں پانچ چیزوں سے دُور رکھے اور پانچ چیزوں کی طرف بلائے۔

من الشک الی الیقین

۱: شکوک وشبہات سے نکال کر یقین کی منزل تک پہنچائے

من الکبر الی التواضع

۲: غرور وتکبر سے دُور کر کے تواضع وانکساری کے قریب لائے۔

من الریاء الی الاخلاص

۳: ریاء کاری سے ہٹا کر اخلاص (خلوص) کی طرف بلائے

من العداوۃ الی النصیحتہ

۴: لوگوں کو بغض وعداوت رکھنے سے روکے اور ان کی خیر خواہی اور بھلائی کی جانب رغبت دلائے۔

من الرّغبته إلى الزهدِ

۵ : دنیا کی محبت سے روکے اور زہد و تقویٰ کی طرف دعوت دے۔

عمل سے دعوت

یقین، تواضع، اخلاص، زہد اور بھلائی کی دعوت صرف زبانی نہیں ہونی چاہیئے بلکہ عمل سے دعوت دینا ضروری ہے۔ صرف زبانی دعوت بے فائدہ ہوتی ہے بلکہ بعض اوقات تو اُلٹا نتیجہ برآمد ہوتا ہے۔ اسلئے کہ اگر کوئی شخص اپنی زبان سے یقین، تواضع اور اخلاص کی طرف دعوت دے لیکن خود اس کی حالت یہ ہو کہ وہ شکوک و شبہات، غرور و تکبر، خود پسندی اور ریاکاری بغض و عداوت میں مبتلا ہو تو دوسرے اس سے کہیں زیادہ مبتلا ہو جائیں گے۔ وہ کہیں گے کہ اگر اس کی باتیں واقعاً سچی ہوتیں تو یہ خود ایسا نہ کرتا۔ عملی طور پر اپنے گفتار و کردار کے ذریعے ان اچھی صفات کی طرف دعوت دینے کا حکم حدیث میں دیا گیا ہے۔ انسان کو چاہیئے کہ وہ دل کی گہرائی اور نورانی بصیرت کے ساتھ لوگوں کو اچھی صفات کی طرف بُلائے۔

کس کی صحبت میں رہیں؟

حضرت عیسیٰ علیہ السّلام کے حواریوں نے ان سے پوچھا "کس کی صحبت میں رہیں؟ آپؑ نے فرمایا" من یذکرکم اللہ رؤیتہ ویزید فی عملکم

منطقہ ویرغبکم فی الاخرۃ عملہ (اصولِ کافی باب مجالستہ العلماء حدیث ۳)

یعنی " ایسے شخص کی صحبت میں رہو جسے دیکھ کر تمہیں خدا یاد آجائے (یعنی مطلب یہ ہے کہ اس کا نورِ یقین، تمہارے وہم وگمان کی تاریکیوں کو ختم کردے اور تم پر پڑے ہوئے غفلت کے پردے ہٹ جائیں۔ اس طرح تم اپنی اصلی فطرت پر لوٹ آؤ اور یادِ خدا سے آشنائی حاصل کرنے لگو۔) اس کی باتیں تمہارے نیک اعمال میں اضافہ کا سبب بنیں اور اس کا کردار تمہیں آخرت کی طرف مائل کردے۔ (بالکل اسی طرح جیسے جب کوئی لاپرواہ مسافر اپنے ہم سفر ساتھی کو زیادہ سے زیادہ زادِ راہ جمع کرتے ہوئے دیکھتا ہے تو وہ خود بھی اپنے لئے زیادہ سامانِ سفر جمع کرنے کی فکر میں لگ جاتا ہے۔)

اہلِ یقین اور اطاعتِ امامؑ

مامون رقی کہتے ہیں کہ میں اپنے مولا حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام کی خدمت میں تھا۔ اتنے میں سہل ابنِ حسن خراسانی آئے سلام کیا اور بیٹھ گئے کہنے لگے یابن رسول اللہ لوگوں کے دل آپ کے ساتھ ہیں آپ اہلبیت امامت و خلافت کے حق دار ہیں۔ پھر بھلا آخر کون سی چیز اس حق کو حاصل کرنے کی راہ میں رکاوٹ ہے؟ آپ کے چاہنے والوں کی ایک لاکھ تلواریں آپ کے ساتھ ہیں۔ امام علیہ السّلام نے فرمایا اے خراسانی بیٹھ جاؤ۔ پھر حنیفہ سے کہا تنور روشن کرو۔ اس کنیز نے تنور روشن کردیا اور آگ کے شعلے بھڑکنے لگے۔

اب آپؑ نے ارشاد فرمایا۔

"اے خراسانی اٹھو اور اپنے آپ کو تنور میں گرادو" خراسانی نے عرض کیا۔ "اے میرے مولاؑ، اے فرزند رسولؐ مجھے آگ کا عذاب نہ دیں مجھے معاف فرمادیں۔ خدا آپ کی مغفرت فرمائے گا۔ آپ نے فرمایا میں نے تمہیں چھوڑ دیا اسی اثنا میں ہارون مکیؒ پہنچے انہوں نے اپنے نعلین اتارتے ہوئے انگشتِ شہادت رکھتے ہوئے کہا السلام علیکم یابن رسول اللہ۔ امام نے فرمایا "نعلین پہنے رہو اور تنور میں کود جاؤ۔

راوی کہتا ہے کہ ہارون مکیؒ نے اپنے ہاتھ نعلین پر سے ہٹائے اور تنور میں کود پڑے امام علیہ السلام نے خراسانی کی طرف رُخ کیا اور خراسان کے بارے میں گفتگو فرمانے لگے۔ آپؑ کی حالت بالکل اسی طرح تھی جیسے کوئی واقعہ ہوا ہی نہ ہو۔ پھر کچھ دیر کے بعد خراسانی سے کہا جاؤ تنور میں دیکھو۔ وہ کہتا ہے کہ میں نے اٹھ کر دیکھا کہ ہارون مکیؒ آرام سے تنور میں بیٹھے ہوئے ہیں۔ اس کے بعد تنور سے نکل کر انہوں نے ہمیں سلام کیا۔ اب امام علیہ السلام نے سہل خراسانی سے فرمایا۔ خراسان میں ایسے کتنے آدمی ہیں؟ اس نے کہا خدا کی قسم ایسا تو ایک بھی نہیں ہے۔ امام علیہ السلام نے فرمایا جب تک ہمارے ایسے پانچ مددگار نہیں ہو جاتے ہم قیام نہیں کریں گے اور ہم بہتر جانتے ہیں کہ کس وقت قیام کرنا چاہیئے۔

عقائد پر یقین

عقائد پر یقین کے آثار لازمی طور پر ظاہر ہونے چاہئیں۔ انہی آثار

کو دیکھ کر پتہ چلے گا کہ کسی شخص کا یقین صادق ہے یا نہیں۔ یہاں پر ہم بطور اختصار چند اہم عقائد اور ان کے نتیجے میں ظاہر ہونے والے آثار کا تذکرہ کریں گے

۱۔ توحیدِ افعالی پر یقین

اس بات پر اعتقاد رکھنا واجب ہے کہ کائنات کے تمام افعال اللہ کے اذن سے ہوتے ہیں اسی کا نام توحیدِ افعالی اور اس پر کامل یقین ہو جائے تو انسان سمجھ لیتا ہے کہ کائنات کا ذرّہ ذرّہ اپنے وجود کو باقی رکھنے اور اپنے خواص کو ظاہر کرنے کے سلسلے میں خداوند متعال ہی کا محتاج ہے۔ یعنی پانی جس طرح اپنے وجود کو برقرار رکھنے میں اللہ تعالیٰ کے لطف کا محتاج ہے اسی طرح اپنی ٹھنڈک اور تری کے ظاہر کرنے میں بھی اپنے خالقِ حقیقی ہی کا مرہونِ منّت ہے۔ اس کے علاوہ دوسرے تمام مرکبات بھی مثلاً آگ اور اس کی گرمی، سورج اور اس کی شعاعیں وغیرہ ایسے ہی ہیں۔ یہاں تک کہ انسان کے افعال اختیاری بھی اذنِ الٰہی اور منشائے پروردگار پر ہی موقوف ہیں۔ لہٰذا اس اعتبار سے انہیں بھی خدا ہی کی طرف نسبت دی جائے گی چنانچہ جیسا کہ درخت کا کوئی پتہ بھی اللہ تعالیٰ کی مشیّت اور اذن کے بغیر نہیں ٹوٹتا اور یہ علمِ الٰہی سے باہر نہیں ہوتا اسی طرح اس کے بنائے ہوئے قانون قاعدوں کی مدد لئے بغیر آدمی اپنے منہ سے کوئی لفظ نہیں ادا کر سکتا اور یہ سب کچھ بھی خدا کے علم میں ہوتا ہے۔

توحیدِ افعالی پر یقینِ صادق

توحید افعالی کی تفصیلات شرک کی بحث میں مذکور ہیں ۔
یہاں پر ہم یہ بتانا چاہتے ہیں کہ جب انسان توحید افعال پر یقین صادق رکھتا ہو تو اس کی کیا کیفیت ہوتی ہے۔ قرآن مجید میں سیکڑوں آیتیں ایسی ہیں جن میں یقین صادق حاصل کرنے کا حکم دیا گیا ہے اور جو شخص بھی ایسا یقین حاصل کرلے اس کا دل روشن ہو جاتا ہے وہ صرف اپنے رب پر ہی توکل (بھروسہ) کرتا ہے۔ وہ اپنے پروردگار کی قضا و قدر پر راضی رہتا ہے اور اس کے ہر فیصلے کو دل و جان سے تسلیم کرنے والا بن جاتا ہے۔ یہی نہیں بلکہ توحید افعالی پر یقین صادق کے نور کی برکت سے اس کا دل غم و غصہ، بغض و عناد اور غیبت و حسد جیسی برائیوں سے پاک ہو جاتا ہے۔

مختصر یہ کہ وہ ہر قسم کی بداخلاقی اور کج روی سے دوری اختیار کرلیتا ہے اور حسن خلق اور انسان دوستی کی لذتوں سے لطف اندوز ہونے لگتا ہے

۲۔ تمام مخلوقات کا رازق

خداوند عالم ارشاد فرماتا ہے کہ کوئی بھی جاندار ایسا نہیں ہے کہ جس کو اللہ تعالیٰ رزق مہیا نہ کرتا ہو۔ خداوند متعال کے اس ارشاد گرامی کی روشنی میں یہ یقین رکھنا چاہیئے کہ ساری خلقت کو رزق فراہم کرنے کی

ذمہ داری اللہ نے خود قبول کی ہے لہٰذا ہر مخلوق کی روزی بھی مقرر ہے اور اسے حاصل بھی ہوگی۔ کوئی بھی قوت اِسے روک نہیں سکتی ! اگر رزق کے سلسلے میں خدا کی رزاقیت پر یقین صادق پیدا ہو جائے تو بلا شبہ دل نور یقین سے منور ہو جاتا ہے۔ اور ہر طرح کے وہم و گمان کا خاتمہ ہو جاتا ہے اور آدمی حرص و لالچ کی شر سے محفوظ ہو جاتا ہے۔ اور وہ کسی چیز کے نہ ملنے سے مایوس نہیں ہوتا

۳۔ ثواب اور عذاب پر یقین

جب انسان اس بات پر یقین رکھتا ہو کہ اس کے تمام عقائد اور اس کی گفتار و کردار کی جزا ثواب یا عذاب کی صورت میں دی جائیگی تو ہمیشہ اچھے افکار و اعمال پر باقی رہنے کی کوشش کرے گا۔ کسی شخص کو یہ معلوم ہو کہ اگر اس نے ذرّہ برابر نیکی کی تو اسے آخرت میں دیکھ لے گا اور اسی طرح اگر اس نے ذرّہ برابر بھی بُرائی کی تو بھی اسے پیش آئے گی تو ایسے شخص کی اطاعت کر کے ثواب حاصل کرنے کی مثال کچھ ایسی ہوگی۔ جیسے ایک بھوکا شخص پیٹ بھرنے کے لئے روٹی چاہتا ہو۔ وہ روٹی حاصل کرنے کے لئے کتنا حریص ہو جاتا ہے اور اُسے محفوظ رکھنے کا کس قدر خواہاں ہوتا ہے۔ بالکل اسی طرح اللہ تعالیٰ سے ثواب حاصل کرنے کا خواہشمند اس کی اطاعت کے سلسلے میں حریص ہوتا ہے اور اس پر برقرار رہنے کے لئے ہمیشہ کوشاں رہتا ہے۔ ایسا شخص جو آخرت کے عذاب پر یقین

رکھتا ہو۔ وہ گناہوں کو زہرِ قاتل سمجھتا ہے۔ وہ جس طرح ہر قسم کے زہر اور ہلاک کر دینے والے جانور سے فرار اختیار کرتا ہے اسی طرح تمام گناہوں سے فرار اختیار کرنے والا ہوتا ہے۔ مختصر یہ کہ جب انسان کا قلب نورِ یقین سے منور ہو جائے تو وہ اطاعتِ الٰہی کے لئے کوشش کرنے والا ہو جاتا ہے اور ہمیشہ اس حرص میں مبتلا رہتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ ہمیشہ اپنے قول و فعل کی اصلاح میں مصروف رہتا ہے اور گناہوں سے دُوری اختیار کرتا ہے یہ سوچ کر کہ کہیں میں تباہ و برباد نہ ہو جاؤں اور جیسے جیسے دل میں نورِ یقین بڑھتا جاتا ہے ویسے ویسے نیکی کی خواہش اور گناہوں سے دُوری کا جذبہ بھی بڑھتا جاتا ہے۔

۴۔ اللہ ہمارے ساتھ ہے

سورۂ حدید کی چوتھی آیت میں ارشاد ہوتا ہے۔ وَ هُوَ مَعَكُمْ اَيْنَ مَا كُنْتُمْ ؕ یعنی "تم جہاں کہیں بھی رہو وہ (خدا) تمہارے ساتھ ہے"۔ اور سورۂ مومن کی آیت انیس ۱۹ میں ارشادِ رب العزت ہے: يَعْلَمُ خَآئِنَةَ الْاَعْيُنِ وَ مَا تُخْفِي الصُّدُوْرُ

یعنی "خدا تو نگاہوں کی خیانت کو بھی جانتا ہے اور ان باتوں کو بھی جو لوگوں کے سینے میں پوشیدہ ہیں"!

مذکورہ بالا آیتوں کی روشنی میں جب مسلمان اس بات پر یقین رکھے کہ خدا ہر جگہ موجود ہے اور بندے کی ہر حالت اور کیفیت سے واقف

ہے یہاں تک کے وہ دلوں کے پوشیدہ راز اور آنکھوں میں چھپے ہوئے اشاروں سے بھی آگاہ ہے تو ظاہر ہے کہ اس یقین کے نتیجہ میں وہ ہمیشہ خود کو اپنے خالق حقیقی کے حضور محسوس کرے گا۔ تنہائی میں ہو یا لوگوں کے ساتھ ساتھ اس کے کردار سے کوئی ایسا فعل ظاہر نہ ہوگا جو خدا کو ناپسند ہو چونکہ اسے معلوم ہے کہ اللہ تعالیٰ میرے باطن سے باخبر ہے لہذا وہ ہمیشہ لوگوں کے سامنے اپنی ظاہری اصلاح سے زیادہ باطنی اصلاح کی فکر میں لگا رہے گا۔

پاؤں تک نہیں پھیلاتے تھے!

محقق اردبیلی کے حالات زندگی میں لکھا ہے کہ انہوں نے اپنی عمر کے آخری چالیس سال اس طرح سے گزارے کے وہ پاؤں تک نہیں پھیلاتے تھے چاہے وہ تنہائی میں ہوں یا لوگوں کے ساتھ اور چاہے وہ سو رہے ہوں یا جاگ رہے ہوں ہر حال میں وہ خود کو خدا کے حضور حاضر و ناظر سمجھتے تھے اور اپنے پاؤں سمیٹے رہتے تھے اور فرماتے تھے کہ

"مجھے خدا کے سامنے پاؤں پھیلاتے ہوئے شرم محسوس ہوتی ہے"۔

اسی طرح بعض دوسرے بزرگ علمائے کرام کے حالات زندگی میں ملتا ہے کہ ایسے بھی عالم گزرے ہیں کہ جاں کنی کے عالم میں جب

ان کا پاؤں سیدھا کیا جانے لگا تو انہوں نے کہا پوری زندگی گزار دی اور اب تک اپنے پروردگار کے حضور ایسی بے ادبی نہیں کی۔ اب جبکہ آخری وقت آگیا ہے اور میں مر رہا ہوں ایسی بے ادبی کیسے کر سکتا ہوں اور پھر جب انہوں نے حالت احتضار میں اپنے پاؤں رو بہ قبلہ کئے تو فرمایا" پروردگارا چونکہ تو نے مجھے اس حالت میں ایسا کرنے کا حکم دیا ہے لہٰذا میں اسے قبول کر رہا ہوں۔

بعض دوسرے جلیل القدر علمائے کرام کے بارے میں ہے کہ وہ بلند آواز سے بات تک نہیں کرتے تھے اور کہا کرتے تھے کہ خدائے ذوالجلال کے حضور میں بلند آواز سے بات کرنا خلافِ ادب ہے۔ قارئین کرام ذرا غور فرمایئے کہ کہاں وہ علمائے کرام جو خود کو ہمیشہ خدا کی بارگاہ میں سمجھے ہوئے اونچی آواز میں بات تک نہیں کرتے تھے اور کہاں ایسے دانشور جو انتہائی بُرے اور نازیبا الفاظ مُنہ سے نکالتے ہوئے ذرا بھی شرم نہیں کرتے ہیں! یہیں سے یقین کی منزل پر فائز ہونے والوں اور اس سے دُور رہنے والوں کا فرق معلوم ہو جاتا ہے۔

یقینِ صادق اور کاذب

یقین سے مراد کسی شے کا اس طرح جان لینا ہے کہ اس کے خلاف معمولی سا بھی شک و شبہ باقی نہ رہے۔

یقین کی دو قسمیں ہیں: ایک یقینِ صادق اور دوسرے یقینِ کاذب، جیساکہ ہم دعاء میں پڑھتے ہیں۔ وَیَقِیْنًا صَادِقًا یعنی: پروردگارا مجھے یقینِ صادق عنایت فرما۔"

یقینِ صادق وہ ہوتا ہے جس کی وجہ سے انسان اس کے اثر کو دل و جان سے قبول کرلیتا ہے اور اس پر عمل کرتا ہے۔ لیکن یقینِ کاذب میں انسان پر وہم و خیال غالب ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آدمی اس کا اثر قبول نہیں کرتا۔ مثال کے طور پر وہ اس بات پر تو یقین رکھتا ہے کہ مردہ خشک لکڑی کے مانند بے حس و حرکت ہوتا ہے اور کسی قسم کا نقصان نہیں پہنچا سکتا۔ لیکن اس کے باوجود وہ مردے کے ساتھ تنہا کمرے میں رہنے سے گھبراتا ہے۔ حالانکہ جب تک وہ مردہ نہیں تھا اس کے ساتھ رہتا تھا اور اُس سے کسی قسم کا خوف نہیں رکھتا تھا۔ اب جبکہ اس کی رُوح بدن سے جدا ہوچکی ہے اس سے خائف نظر آتا ہے۔ یہ خوف اس لئے ہے کہ اُس کی عقل پر وسوسہ اور وہم غالب آچکا ہے۔ اسی لئے وہ اپنے یقین کے واقعی اثر کو قبول کرنے سے قاصر ہے۔

اسی طرح دینی امور میں بھی یقینِ کاذب ہوتا ہے۔ مثلاً ایک شخص یقین رکھتا ہے کہ خداوند عالم، رزّاق ہے۔ لیکن اس کے باوجود اپنے روزی کے سلسلے میں غم و غصّہ کا اظہار کئے بغیر نہیں رہ سکتا! بعض اوقات تو ایسا ہوتا ہے کہ انسان اُن آنے والے دنوں کے سلسلے میں بلکہ آنیوالے برسوں کی روزی کے سلسلے میں بھی پریشان رہنے لگتا ہے کہ آئندہ کیا ہوگا

اور وہ کہاں سے کھائے گا حالانکہ وہ یہ جانتا ہے کہ جس نے دانت عطا کئے ہیں وہی انہیں کھانے کے لئے روٹی بھی فراہم کرے گا۔ اسی طرح جب کوئی شخص اس بات پر یقین رکھتا ہو کہ تمام حالات قضا و قدر الٰہی اور مشیت پروردگار سے وقوع پذیر ہوتے ہیں تو پھر اسے ہر معاملے میں صبر و رضا اور تسلیم و توکل سے کام لینا چاہیئے۔

آدمی جب اس بات پر یقین رکھتا ہو کہ کسی بھی لمحے موت آسکتی ہے تو پھر آخر وہ لالچ اور کنجوسی کیوں کرتا ہے؟ کسی سے بلا وجہ دشمنی کیوں کرتا ہے؟ اور فتنہ و فساد کیوں برپا کرتا ہے؟ یہی وجہ ہے کہ امیر المومنین حضرت علی علیہ السّلام فرماتے ہیں:

"مارأیتُ یقیناً اشبہ بالشک من الیقین بالموت"

یعنی: میں نے اس قسم کا کوئی یقین نہیں دیکھا جس میں لوگ اس طرح سے شک کرتے ہوں جیسے موت پر یقین کے ساتھ شک میں مبتلا رہتے ہیں۔

حضرت علیؑ یہ بتا رہے ہیں کہ لوگوں کا عمل ایسا ہے کہ جیسے وہ اپنے مرنے کے بارے میں شک کرتے ہوں اور انہیں اپنی موت کا یقین نہیں ہے۔ اگر لوگوں کے حالات کا بغور جائزہ لیا جائے تو بخوبی عیاں ہو جاتا ہے کہ ان کے اعمال ایسے ہیں جیسے انہیں اپنی موت کا یقین ہی نہیں ہے اور وہ ہمیشہ اس دنیا میں رہیں گے!

؎ سامان سو برس کا ہے پل کی خبر نہیں

کوئی شخص اگر بروز قیامت جزا اور سزا پانے پر یقین رکھتا ہو اور وہ اس بات کو بھی دل سے قبول کرتا ہو کہ اُسے نامۂ اعمال عطا کیا جائے گا اور اس کی ذرّہ برابر نیکی اور بدی دکھادی جائے گی تو اسے لازمی طور پر قول و قبول کے سلسلے میں محتاط رہنا چاہیئے۔ اس کا دل کبھی خوفِ خدا سے خالی نہیں رہ سکتا تو پھر اس کے برعکس یہ بے حسی کیوں۔

ایمان کی پہچان خوفِ خُدا

روایت میں ہے کہ جب عرب کے ایک صحرانشین شخص نے ایمان قبول کر لیا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے بعض اصحاب کو حکم دیا کہ اسے قرآن کی تعلیم دیں۔ اس نے سورۂ زلزال یاد کر لینے کے بعد کہا "میرے لئے اتنا ہی کافی ہے"۔ اس کے بعد رسول اللہ سے سوال کیا "کیا بروز قیامت ذرّہ برابر چیز کے متعلق بھی پوچھا جائے گا؟" آپؐ نے فرمایا "ہاں!" یہ سن کر عرب کے اس بادیہ نشین شخص نے چیخ کر اور آہ و بکا کرتے ہوئے کہا۔ ہائے فضیحت۔ ہائے رُسوائی۔

آنحضرت نے فرمایا: "اس کی قلب، ایمان کی لذت سے آشنا ہو گیا ہے"۔ یعنی خوفِ خدا اس امر کا گواہ ہے کہ اس کے دل میں نورِ ایمان پیدا ہو گیا ہے اور اس نے دل کی گہرائی سے قیامت پر یقین کر لیا ہے۔

مختصر یہ کہ اس قسم کے بہت سے سوالات کئے جا سکتے ہیں اور

ان سوالوں کو ایک جملے میں یوں سمیٹا جاسکتا ہے کہ ان اُمور پر اعتقاد اور یقین ہے یا نہیں؟ اگر نہیں تو نعوذ باللہ یہ کفر ہے۔ اور اگر ہے تو اُن سے مرتب ہونے والے لازمی آثار کہاں ہیں؟

ایسے تمام سوالوں کا جواب یہ ہے کہ عقائد تو اپنی جگہ ہیں لیکن روحانی اور معنوی قوّت کم ہو جانے کی وجہ اور خواہشاتِ حیوانی کے غالب آجانے کے باعث ان عقائد کے واقعی اور عملی آثار ظاہر نہیں ہو پاتے کیونکہ جب آدمی کی روحانی اور معنوی قوت ختم ہو جاتی ہے تو وہ ایک جانور کے مانند ہو جاتا ہے۔ نہ تو اس کا کسی معنوی قوّت پر اعتقاد باقی رہتا ہے اور نہ ہی اس میں کسی یقینی بات کو قبول کرنے کی صلاحیّت رہتی ہے۔ وہ بس ایک چوپائے کی طرح ہو جاتا ہے بلکہ اُس سے بھی بدتر۔ جیسا کہ سُورہ اعراف کی آیت ۱۷۹ میں ارشاد ہے۔ اُولٰئِکَ کَالْاَنْعَامِ بَلْ ھُمْ اَضَلّ۔ اور سورۂ اعراف ہی کی آیت نمبر ۱۷۹ میں ارشاد باری تعالیٰ ہے: لَھُمْ قُلُوْبٌ لَا یَفْقَھُوْنَ بِھَا۔ یعنی: "ان کے دل تو ہیں لیکن (حیوانی خواہشات کے غالب آجانے کے باعث) وہ اُس سے سمجھنے (اور نورِ ایمان حاصل کرنے) کی صلاحیّت ہی نہیں رکھتے"۔

اس مسئلے کا علاج یہ ہے کہ آدمی اپنے آپ کو معنوی اور رُوحانی طور پر طاقت ور بنائے۔ اس کے لئے زیادہ سے زیادہ وعظ و نصیحت پر توجہ دے۔ جہاں تک ممکن ہو اپنی خواہشات نفسانی کو قابو میں رکھنے کی سعی کرے آخرت کی ابدی زندگی کو ہمیشہ پیش نظر رکھے اور دُنیا کی چند

روزہ زندگی کو سب کچھ نہ سمجھ بیٹھے۔ ایسے افراد کے ساتھ رہے جو روحانی اعتبار سے مضبوط ہوں اور ان لوگوں کا ساتھ چھوڑ دے جو اس مادی دنیا کی ہوا و ہوس میں مُبتلا ہیں۔

فصل ۲

زمین و آسمان کی خلقت کا مقصد

آسمان اور زمین کی غرضِ خلقت بیان کرتے ہوئے خداوند عالم ارشاد فرما رہا ہے:

اَللّٰهُ الَّذِیْ خَلَقَ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ وَّمِنَ الْاَرْضِ مِثْلَهُنَّ ؕ یَتَنَزَّلُ الْاَمْرُ بَیْنَهُنَّ لِتَعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ عَلٰی كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ ۙ وَّ اَنَّ اللّٰهَ قَدْ اَحَاطَ بِكُلِّ شَیْءٍ عِلْمًا ۠

(سورۂ طلاق ۶۵ آیت ۱۲)

یعنی: "اللہ ہی تو ہے جس نے سات آسمان پیدا کیے اور انہیں کی مانند زمین بھی خلق فرمائی۔ ان میں خدا کا حکم نازل ہوتا رہتا ہے تاکہ تم جان لو کہ خدا ہر چیز پر قادر ہے۔ اور بے شک خدا اپنے علم سے ہر چیز پر حاوی ہے۔"

آیت میں آسمان و زمین کی تخلیق پر توجہ دلانے کا مقصد یہ ہے کہ انسان اس پر غور کرکے اللہ تعالیٰ کی قدرتِ کاملہ اور اس کے

لامتناہی علم پر یقین حاصل کرے۔ اس بنا پر ہم کہیں گے کہ کائنات کی خلقت کا مقصد صرف یہی نہیں کہ انسان محض اللہ تعالیٰ کی اجمالی معرفت حاصل کرے بلکہ اُسے چاہیئے کہ کمالِ معرفت پیدا کرے۔ حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں:

وَكَمَالُ مَعْرِفَتِهِ التَّصْدِيقُ بِهِ "یعنی: "اللہ تعالیٰ کی معرفت کا کمال یہ ہے کہ قلب کی گہرائی سے اس کی تصدیق کرے۔"

قلب کی گہرائی سے معرفتِ پروردگار کا مطلب یہ ہے کہ انسان کا عقیدہ کسی قسم کے شکوک و شبہات کی وجہ سے متزلزل نہ ہو۔ دل نورِ ایمان سے ایسا روشن ہو جائے کہ اُسے ایک قسم کا کیف و سرور حاصل ہونے لگے۔ کتاب "اصول کافی" میں دل کی گہرائی سے معرفت حاصل کر لینے والے شخص کی بہت سی نشانیاں حدیثوں میں بیان ہوئی ہیں۔ ان میں سے ایک نشانی یہ ہے کہ ایسی معرفت رکھنے والا اس مادی دنیا کو بالکل معمولی سمجھتا ہے اور عالمِ بقا (آخرت) کو بہت عظیم جانتا ہے۔

ہر چاہنے والا خود حق و صداقت اور یقین کی منزل تک پہنچ سکتا ہے۔ البتہ یہ راستہ اتنا آسان نہیں ہے۔ منزلِ یقین تک پہنچنے کیلئے سخت زحمتیں برداشت کرنی پڑتی ہیں۔ یقین کا تعلق دل سے ہے۔ اِس دل کو کشادہ کرنا ہوگا تاکہ اس میں علم کا نور اور یقین پیدا ہو سکے۔ دل پر جو ہوا و ہوس اور دیگر خواہشات کے پردے پڑے ہوئے ہیں۔ ہر حال میں انہیں ہٹانا ہوگا۔

علی الاعلان یہ کہنا ہوگا کہ آدمی کے لئے علم و معرفت اور یقین و شہود کی منزل تک پہونچ کر معرفتِ الٰہی حاصل کرنے کی راہ میں جو سب سے بڑی رکاوٹ ہے وہ "اپنی انا کا بت" ہے! یہ "انا" ہی تو ہے جس کی وجہ سے آدمی، انسانی کمالات حاصل کرنے سے قاصر رہتا ہے۔ جب تک کوئی شخص خود کو بہت کچھ سمجھتا ہو، اپنا ایک برتر مقام چاہتا ہو۔ مال و دولت کے اعتبار سے برتری کا خواہاں ہو، ناممکن ہے کہ وہ خدا کو دل کی گہرائی سے دیکھ سکے اور حق کا حامی رہے۔

ایسا شخص تو اپنی ذات کو حق و باطل کا معیار قرار دینے لگتا ہے۔ کچھ اس طرح کہ جو اس کی مرضی کے مطابق ہو وہ حق ہے اور جو اس کی مرضی سے ہٹ کر ہو وہ باطل ہے۔

اس قسم کے لوگ بدترین کاموں کا ارتکاب کرتے ہیں لیکن اس کے باوجود اسے برحق گردانتے ہیں جیسا کہ سورۂ کہف کی آیت ۱۰۴ میں ہے:

وَهُمْ يَحْسَبُوْنَ اَنَّهُمْ يُحْسِنُوْنَ صُنْعًا

"وہ اس خام خیالی میں ہیں کہ وہ یقیناً اچھے کام کر رہے ہیں"

خواہشاتِ نفسانی قلبی معرفت کی راہ میں بڑی رکاوٹ ہیں حضرت امام سید سجاد علیہ السّلام دعائے ابوحمزہ ثمالی میں خدا کے حضور یوں گویا ہیں:

"اِنَّكَ لَا تحتجب عن خلقك اِلَّا اِن تحجبهم الآمال دونك"۔

خداوندا! تو اپنی مخلوق سے پوشیدہ نہیں ہے۔ لیکن یہ لوگوں

کی خواہشاتِ نفسانی اور تمنائیں ہیں جن کی وجہ سے وہ تجھے دیکھنے سے قاصر ہیں۔

حضرت امام حسین علیہ السّلام دُعائے عرفہ میں فرماتے ہیں:

عَمِیَتْ عَیْنٌ لاتَرَاكَ

"وہ آنکھ اندھی ہوجائے جو تجھے نہ دیکھ سکے۔"

ایک بزرگ فرماتے ہیں: صرف ایک قدم آگے بڑھانے کی ضرورت ہے اس سے زیادہ نہیں بس خدا مل جائے گا۔ اور وہ ایک قدم اپنی اَنا کے بت کو توڑنے کے لئے آگے بڑھانا ہوگا۔ جیسے ہی انسان اپنی اَنا کو ختم کردیتا ہے حق تک رسائی حاصل کرلیتا ہے۔ جب اپنی اس "میں" کو ہٹا دیتا ہے تو خُدا کی حقیقی معرفت کی راہ میں حائل حجاب ہٹ جاتا ہے۔ کوشش کی جائے کہ یہ حجاب اگر ہلکا نہیں ہوسکتا تو کم از کم مزید بھاری تو نہ ہو۔

جوان عام طور پر فطرتِ انسانی سے قریب ہوتے ہیں۔ ان پر یہ "میں" کا پردہ بھی کم اور ہلکا ہوتا ہے یہی وجہ ہے کہ جب انہیں یادِ خدا کی طرف مائل کیا جاتا ہے تو وہ بڑی جلدی اس اثر کو قبول کرلیتے ہیں۔

آج کل ہمارے یہ جوان بڑے ذوق و شوق سے محاذِ جنگ پر جارہے ہیں۔ حد تو یہ ہے کہ رو رو کر محاذ پر جانے کی التجا کرتے ہیں۔ ایسا اسی لئے تو ہے کہ اُن کے دلوں پر یا تو کسی قسم کی غفلت کا پردہ یکسر نہیں ہے یا اگر ہے بھی تو بہت معمولی سا ہے۔ یہی تو وجہ ہے کہ وہ اپنا سب کچھ اللہ کی راہ میں قربان کررہے ہیں۔

البتہ جب آدمی خواہشات اور آرزوؤں کے سمندر میں ڈوب جاتا ہے اور خود کو خواہشاتِ نفسانی کی موجوں کے حوالے کر دیتا ہے تو روز بروز اس کی انانیت مضبوط ہوتا چلا جاتا ہے یہاں تک کہ ایک مرحلہ ایسا بھی آجاتا ہے جب وہ یہ کہنے لگتا ہے کہ "بس میں ہوں اور خدا نہیں ہے!" گویا وہ خود کو ایک مستقل موجود قرار دے دیتا ہے! اس قسم کے دعوے اور حقیقت میں کیا ربط ہے؟ حقیقت تو یہ ہے کہ بندہ نہ تو اپنے آپ کو بغیر اذنِ پروردگار کے کوئی فائدہ پہنچانے پر قادر ہے اور نہ ہی کوئی نقصان۔ نہ تو وہ خود کو مار سکتا ہے اور نہ ہی زندہ رکھ سکتا ہے اور نہ ہی مرنے کے بعد دوبارہ اُٹھ سکتا ہے۔

"لا یملک لنفسہ نفعاً و لا ضرا و لا موتا و لا حیوۃ و لا نشورا" کا یہی مطلب تو ہے۔ خوب اچھی طرح سمجھ لینا چاہیئے کہ تمام موجوداتِ عالم اپنا کوئی مستقل وجود نہیں رکھتے بلکہ ان کے پاس جو کچھ بھی ہے وہ اللہ تعالیٰ کا عطا کردہ ہے۔

انسان اگر اپنے بارے میں مخلص ہے تو اُسے کبھی بھی اپنے قلب سے لاپرواہ نہیں ہونا چاہیئے۔ اور اس پر "میں" کا پردہ نہیں پڑنے دینا چاہیئے اور خواہشات نفسانی کی پیروی کرنے سے ڈرنا چاہیئے راہِ خدا کو چھوڑ کر خواہشات کی پیروی جنگل کے دیو سے زیادہ خطرناک اور تباہ کن ہے۔ شاعر نے کیا خوب کہا ہے ؎

حذر از پیروی نفس کہ در راہِ خدا ∴ مردم افگن تر ازین غول بیابانی نیست

حقائق پر یقین رکھنا اور ہوس پرستی دونوں ایک ساتھ جمع نہیں ہوسکتے۔ سورۂ جاثیہ کی آیت ۲۳ میں ارشاد ہے:

اَفَرَءَیْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰهَهٗ هَوٰىهُ

"بھلا تم نے اس شخص کو بھی دیکھا ہے جس نے اپنی نفسانی خواہش کو معبود بنا رکھا ہے!"

آدمی اگر اپنی خواہشات کو معبود بنا ڈالے اور اس کے ہر حکم کی اطاعت کرنے لگے تو خداوند متعال سے حقیقی ربط کیسے قائم کرسکتا ہے۔ انسان خواہ کتنی ہی کتابیں پڑھ لے لیکن جب تک دل میں یقین کا نور پیدا نہیں ہوگا یہ کتابی بحث و مباحثہ اُسے کوئی خاص فائدہ نہیں پہنچائے گا۔

حضرت علی علیہ السلام عثمان ابن حنیف کو خط لکھتے ہوئے مکتوب شمارہ ۴۵ میں فرماتے ہیں:

"وَاِنَّمَا نَفْسِیْ اَرُوْضُهَا بِالتَّقْوٰی لِتَاْتِیَ اٰمِنَةً یَوْمَ الْخَوْفِ الْاَکْبَرِ"

یعنی "میں اپنے نفس کو تقویٰ کا پابند رکھنے کے لئے ریاضت کرتا ہوں تاکہ اُس بڑے خوف (قیامت) کے دن آرام سے رہے"

معلوم ہوا کہ سب سے بڑی رکاوٹ آدمی کا اپنا نفس ہے۔ نفس کو ریاضت کی منزلوں سے گذارنے کی ضرورت ہے۔ ایسے کام کرنے چاہئیں جن سے نفس پر موجود حجاب اور رکاوٹیں دُور ہوجائیں۔ علم یقین

کی منزل صرف پڑھنے لکھنے ہی سے حاصل نہیں ہوتی بلکہ اس کے لئے علیحدہ سے نفس کو تربیت دینا پڑتی ہے جب تک یہ اپنی اَنا کا بُت ہے اور "میں" ہے اس وقت تک پروردگار عالم کی اطاعت نہیں ہو سکتی اپنی اَنا کے بت کو توڑنا ہوگا۔ نفس پر پڑے ہوئے پردے کو ہلکا کرنے کے لئے خدا سے مناجات کرنا انتہائی فائدہ مند ہے۔ پروردگار عالم سے راز و نیاز اور اس کے سامنے فریاد کرنے سے قلب پر پڑے ہوئے پردے ہٹنے لگتے ہیں۔ مناجات شعبانیہ اور ایسی ہی دوسری مناجاتوں سے غافل نہیں ہونا چاہیئے۔

"وَانفساہ من ھوی قد غلبنی" یعنی: خداوندا! افسوس کہ اس خواہش نفسانی نے غلبہ حاصل کر کے مجھے ہلاک کر دیا۔ "وَمن عدو قد استکلب علیّ" اس نفس نے مجھ پر کتے کی طرح حملہ کر دیا۔ یہ نفس مجھے کبھی چین سے رہنے نہیں دیتا۔ اگر کوئی شخص دل کی گہرائی سے کہدے "اِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ"۔ یعنی اے خدا میں تجھ سے ہی مدد چاہتا ہوں۔ جب ایسی دُعا پورے خلوص کے ساتھ خدا سے کی جائے تو وہ ضرور مدد فرمائے گا۔

مسلسل کوشش

انسان کو چاہیئے کہ اپنے نفس کی اصلاح کے لئے مسلسل کوشش کرتا رہے۔ دل کی گہرائی سے اللہ تعالیٰ کی معرفت حاصل کرے اس طرح

اپنی قلبی معرفت کو مضبوط سے مضبوط تر کرنے کی سعی کرتا رہے۔ اگر علم و یقین کی منزل پر فائز ہے تو اس کا لازمی اثر اپنے پروردگار سے گہری محبت کی صورت میں ظاہر ہونا چاہیئے۔ پھر علم یقین کے بعد اگر عینِ یقین کی منزل ہے تو اپنے رب سے یہ تعلق اور گہرا ہو جانا چاہیئے۔ کہتے ہیں کہ انسان احسان کا غلام ہوتا ہے۔ کسی نے اگر آپ پر مہربانی کی اور احسان کیا تو آپ اس کے گرویدہ اور شیدائی ہو جاتے ہیں۔ مثلاً آپ کی آنکھ میں تکلیف تھی کسی ڈاکٹر نے اس کا صحیح علاج کر دیا تو آپ اس کے چاہنے والے ہو جائینگے۔ ذرا سوچئے کہ وہ خدا جس نے خود یہ آنکھیں آپ کو عطا کی ہیں اور اتنا بڑا احسان کیا ہے اسے کیونکر بھلایا جا سکتا ہے۔ وہ خدا جس نے ہمارے پورے وجود کو خلق کیا اس کا ہمیں کس درجہ چاہنے والا اور شیدائی ہونا چاہیئے؟ اسی نے تو کائنات کی تمام چیزوں کو خلق فرمایا ہے اور سب کچھ اسی کا دیا ہوا تو ہے کسی شاعر نے کیا خوب کہا ہے ؎

بہ جہان خرم از آنم کہ جہان خرم از اوست
عاشقم بر ہمہ عالم کہ ہمہ عالم از اوست

یعنی میں اس دنیا میں اس لئے خوش ہوں کہ یہ خوشنما دنیا اس (خدا) نے پیدا کی ہے اور یہ اُسی کی ہے۔ میں اس دنیا کی تمام چیزوں کا اسی لئے عاشق ہوں کہ یہ ساری دنیا اُسی کا ظہور ہے۔

دنیا کی جس چیز پر بھی انسان نظر کرے اُسے دیکھ کر خدا کو یاد کرنا چاہیئے اور اس کی محبت میں اضافہ ہونا چاہیئے۔ آدمی کائنات کی جس جس چیز

کا بھی بغور جائزہ لے گا اس کے دل میں پروردگار کی معرفت بڑھتی چلی جائے گی اور قلب پر موجود تاریکیوں کے پردے ہٹتے چلے جائیں گے۔ یہاں تک کہ وہ اپنے پروردگار کو حاضر و ناظر پائے گا اور پھر تنہائی میں اپنے پروردگار سے دعا اور مناجات کرتے ہوئے کہے گا: "وَقُل رَّبِّ زِدْنِي عِلْمًا" (سورۂ طٰہٰ آیت ۱۱۴) یعنی: اے رسولؐ! کہیئے کہ پالنے والے میرے علم میں اضافہ فرما۔"

عین الیقین: دل کی آنکھوں سے دیکھنے کا نام ہے۔ حضرت موسیٰؑ علمِ یقین کی منزل پر فائز تھے۔ وہ اللہ تعالیٰ سے ہم کلام ہوا کرتے تھے۔ سورۂ نساء کی آیت ایک سو چونسٹھ میں ہے۔

"وَكَلَّمَ اللَّهُ مُوسَىٰ تَكْلِيمًا" یعنی: اللہ تعالیٰ نے موسیٰؑ سے اس طرح بات کی ہے جیسے بات کرنے کا حق تھا) حضرت موسیٰؑ اللہ تعالیٰ سے اپنی قلبی کیفیت کے ذریعے باتیں کیا کرتے تھے۔ ایک اور مقام پر ارشادِ رب العزت ہے۔ "نزل به الروح الامين على قلبك" (سورۂ شعراء: آیت ۱۹۳) اس آیت میں حضرت جبرائیلؑ کے ذریعہ قلب تک پیغام پہنچانے کا تذکرہ ہوا ہے۔

اللہ تعالیٰ سے ہمکلام ہونے کے بعد حضرت موسیٰ علیہ السّلام نے دیکھنے کی خواہش کی۔ اور کہا پروردگار! میں تجھے دیکھنا چاہتا ہوں۔ جناب موسیٰ کے بارے میں یہ تصوّر تک کرنا صحیح نہیں ہے کہ انہوں نے اپنی ظاہری آنکھوں سے خدا کو دیکھنے کی خواہش کی ہوگی۔ وہ جانتے تھے کہ اللہ تعالیٰ کو ان آنکھوں سے دیکھنا محال ہے۔ آدمی کی ظاہری آنکھیں جسموں کو دیکھ سکتی

ہیں۔ یہ آنکھیں ظاہری رنگوں کا مشاہدہ کر سکتی ہیں اور انھیں دیکھنے کے لئے بھی چند شرائط کا ہونا ضروری ہے۔ یعنی یہ کہ وہ چیز بہت دُور یا بہت قریب نہ ہو۔ درمیان میں کوئی پردہ حائل نہ ہو اور تاریکی نہ ہو۔ جب یہ شرائط موجود ہوں گی تو آدمی کسی چیز کو دیکھ سکتا ہے۔ اس طرح انسان کے دیکھنے اور جانور کے دیکھنے میں کوئی فرق نہیں پایا جاتا۔

اللہ تعالیٰ جسم و جسمانیت سے پاک و پاکیزہ اور مبرّا ہے۔

"جسم الاجسام و لا یقال لہ الجسم و کیف الکیف فلا یقال لہ کیف و این الاین فلا یقال لہ این"

وہ جسموں کا خالق ہے تو بھلا خود مجسّم کیسے ہو سکتا ہے۔ جسم تو خود اپنے اجزائے ترکیبی کا محتاج ہوتا ہے۔ جسم حادث ہوتا ہے۔ جسم ممکن الوجود ہوتا ہے اور اس کے لئے جگہ کی ضرورت ہوتی ہے۔ خداوند عالم نے آسمان اور زمین کو خلق کیا ہے۔ اس نے زمان و مکان کو خلق کیا ہے تو پھر اس پر زمانے کے حوادث کیسے طاری ہو سکتے ہیں اور اسے کسی جگہ کیسے معین کیا جا سکتا ہے۔

حضرت موسیٰؑ نے اللہ تعالیٰ کو دیکھنے کی جو خواہش کی ہے۔ اُس کے بارے میں کوئی یہ گمان نہ کرے کہ یہ آنکھ سے دیکھنے کی خواہش تھی۔ جواباً ارشادِ خداوندی ہوا" لن ترانی یا موسیٰ" یعنی (اے موسیٰ تم مجھے ہرگز نہیں دیکھ سکتے) ممکن ہے کہ یہاں لن ترانی سے اس بات کی طرف اشارہ ہو اکہ اے موسیٰ جب تک تم ہر قسم کے حجاب سے باہر نہیں آجاتے

مجھے دیکھنا محال ہے۔ جب تک کہہ رہے ہو کہ خداوندا "تو مجھے خود کو دکھادے تو یہ خود مجھے اور میں ایک قسم کا حجاب ہے۔ البتہ یہ باتیں ایسی دقیق اور باریک ہیں جن کی حقیقتوں سے آشنائی حاصل کرنا ہمارے بس میں نہیں ہے۔

خداوند عالم نے حضرت موسیٰ کے جواب میں فرمایا: "ولکن انظر الی الجبل فان استقر مکانہ فسوف ترانی (سورۂ اعراف: آیت ۱۴۳) یعنی: "تم مجھے ہرگز نہیں دیکھ سکتے مگر اس پہاڑ کی طرف دیکھو (ہم اس پر اپنی تجلّی ڈالتے ہیں) پس اگر پہاڑ اپنی جگہ پر قائم رہے تو سمجھنا کہ عنقریب مجھے بھی دیکھ لو گے۔"

آیت میں "جبل" یعنی پہاڑ سے مراد "اپنی اَنا کا پہاڑ" بھی ہو سکتا ہے۔ یہ بہت بڑا پردہ ہے اور یہ "میں کا پہاڑ" جب تک ریزہ ریزہ نہیں ہو جاتا شہود کی منزل حاصل نہیں ہو سکتی۔ یہی وجہ ہے کہ جب تجلّیٔ پروردگار حاصل ہوتی ہے تو "میں" کے اس بڑے پردے کو دھچکا لگتا ہے اور بیہوشی طاری ہو جاتی ہے۔ ممکن ہے اسی آیت میں خرّ موسیٰ صعقًا سے تعبیر کیا گیا ہو۔ (یعنی: اللہ کو منزل شہود پر پاکر موسیٰؑ پر بیہوشی طاری ہو گئی۔)

یہاں یہ بھی عرض کر دینا ضروری ہے کہ آیت میں اس معنی کا احتمال لیا جا سکتا ہے نہ یہ کہ یہ معنی سو فیصد ہیں۔ ہمارا کہنے کا مطلب یہ ہوا کہ آیت میں احتمال یہ بھی پایا جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ہیبت و جلالت کی وجہ سے جب "میں" کا خاتمہ ہوا تو بے ہوشی کی سی کیفیت طاری ہو گئی

اور اس طرح خدا کے شہودِ قلبی کی آمادگی پیدا ہوئی۔

جب انسان عین یقین تک رسائی حاصل کرلے تو اُسے بلند مرتبے اُس حقِ یقین تک پہنچنے کی کوشش کرنا چاہیئے۔ جہاں "میں" کا ذرہ برابر بھی شائبہ باقی نہیں رہتا اس بلند مرتبے پر ہمارے آخری نبیؐ فائز ہیں۔ آپؐ کے کسی کام میں "میں" کا پہلو نظر نہیں آتا اور سجدہ کی دعا میں یوں فرماتے ہیں: "ربّ لا احصی ثناء علیك انت کما اثنیت علی نفسك" یعنی: پروردگارا! میں تیری مکمل طور پر حمد و ثناء کرنے والا کون ہوتا ہوں جب کہ تو نے خود مکمل طور پر اپنی حمد و ثناء نہیں کی ہے۔ تیری تعریف و توصیف اور حمد و ثنا بس تجھ ہی کو زیب دیتی ہے اسی طرح آپؐ پندرہ شعبان کی شب سجدہ میں فرماتے ہیں" سجد لك سوادی و خیالی و آمن بك فؤادی"۔ یعنی: خداوندا میری تمام چیزیں تجھے سجدہ کرتی ہیں میرا بدن میرے خیالات اور میرا دل سب کچھ تیرے حضور میں سجدہ ریز ہے۔ "ما عرفناك حق معرفتك" جس طرح سے تیری معرفت ہمیں حاصل کرنا چاہیئے تھی وہ ہم حاصل نہیں کرسکے"۔ ممکن الوجود یعنی مخلوق پھر مخلوق ہے۔ بندہ بہر حال بندہ ہے اور خدا خدا ہے۔ حضرت محمدؐ کبھی بھی خدا نہیں ہو سکتے حالانکہ قربِ الٰہی کے جس اعلیٰ درجہ پر آپ فائز ہیں اور حقیقت کی جن منزلوں کو آپنے کشف فرمایا ہے وہ خوبی کسی دوسرے کو حاصل نہیں ہوسکی۔ لیکن اس کے باوجود خدا کے حضور فرماتے ہیں۔ " ما عبدناك حق عبادتك" یعنی: "تو جس طرح عبادت کا

سزاوار ہے ہم تیری عبادت نہیں کر سکے۔

ہمیں چاہیئے کہ ہم بلند روحانی درجات حاصل کرنے کے سلسلے میں مسلسل کوشاں رہیں۔ ایسا نہ ہو کہ کسی منزل پر رک کر یہ کہہ دیں کہ بس یہی کافی ہے۔ مزید آگے نہیں بڑھنا ہے۔ الٰہی توفیقات اور اس کے لطف و کرم سے ہمیں آگے بڑھتے رہنا چاہیئے۔ اس کے علاوہ بلند سے بلند منزل پر پہنچنے کے باوجود بھی مغرور نہیں ہونا چاہیئے۔ جس مرتبہ پر بھی پہنچیں اس سے آگے بلند مرتبہ کو ذہن میں رکھنا چاہیئے۔ اچھی طرح سمجھ لینا چاہیئے کہ ہر درجہ سے بلند کوئی نہ کوئی اور درجہ بھی ہوتا ہے۔ "وفوق کل ذی علم علیم یعنی: ہر صاحب علم سے کوئی نہ کوئی اور زیادہ جاننے والا ہوتا ہے۔

اَوَّلُ الدِّیْنِ مَعْرِفَتُہٗ وَ کَمَالُ مَعْرِفَتِہِ التَّصْدِیْقُ بِہٖ"

"دین کی ابتدائی منزل اللہ تعالیٰ کی معرفت حاصل کرنا ہے اور معرفت کا کمال دل کی گہرائی سے اُس (ذات لم یزل ولایزال) کی تصدیق کرنا ہے"

صرف پڑھنے لکھنے سے آدمی اطمینان و سکون حاصل نہیں کر سکتا بلکہ قلبی ایمان، اطمینان کا باعث ہے۔ یہ بات بہت اہم ہے اسے بار بار دہرانے کی ضرورت ہے تاکہ ذہنوں میں کسی قسم کا شک و شبہ نہ رہے۔ کوئی یہ گمان نہ کر بیٹھے کہ صرف عقلی دلیلوں کی مدد سے کسی بات کو ثابت کر دینا ہی کافی ہوتا ہے۔ توحید، نبوت اور قیامت کا عقلی دلیل کی روشنی میں قائل ہو جانا، ناقص معرفت ہے۔ اس

سے شکوک وشبہات میں پڑ جانے کا خطرہ باقی رہتا ہے۔ ہوسکتا ہے کہ کسی موقع پر یہ شکوک وشبہات اُسے تباہ وبرباد کردیں۔ اطمینان تو ایمانِ قلبی کے ذریعے ہی حاصل ہوتا ہے۔ عقل سے جو معرفت حاصل کی ہے دل سے اس کی تصدیق ہونی چاہیئے۔ اگر دل میں یقین ہے تو ایمان کے آثار اعضاء وجوارح سے ظاہر ہوں گے۔ جو شخص قلب کی گہرائی سے مانتا ہے کہ عالم اور قادر خدا اُسے نعمتیں عطا کرنے والا ہے اس کے دل میں دنیا کی محبت کبھی جڑ نہیں پکڑ سکتی۔ وہ تمام گناہوں سے اجتناب کرنے والا ہوگا۔ حالانکہ ہم دیکھتے ہیں کہ بہت سے لوگ عقائد پر بڑی عمدہ عمدہ دلیلیں پیش کرتے ہیں لیکن ان کا دل انہیں قبول نہیں کرتا! ان کے پاس زبانی دعوے کے علاوہ اور کچھ نہیں ہوتا! ان کا دل کیا چاہتا ہے؟ "دنیا" پس جب تک دل دنیا کی محبت میں گرفتار ہے تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ اُن کا ایمان اسی دنیا پر ہے! ان کا دل کیا چاہتا ہے؟ "صرف اس دُنیا میں مادی اعتبار سے "ترقی"! پس اس مادی ترقی پر ان کا ایمان ہے! لہٰذا معلوم ہوا کہ جس نے پڑھ لکھ کر علمی اصطلاحات یاد کرلی ہیں تو یہ اس بات کی ضمانت نہیں ہیں کہ ان کا دل ایمان کے نور سے روشن ہوگیا ہے۔

میں ایک مثال پیش کرتا ہوں۔ انسان کی عقل کہتی ہے، بلکہ اُسے قطعی طور پر یقین ہے کہ ہر شخص کو اس دنیا سے اُٹھ جانا ہے۔ یعنی موت برحق ہے۔ وہ یہ دلیل بھی دیتا ہے کہ ہر موجود کو ایک خاص مقصد

کے تحت خلق کیا گیا ہے جب وہ اپنے مقصد تک رسائی حاصل کر لیتا ہے تو اس کی موت واقع ہو جاتی ہے۔ آخر یہ لوگ حقیقت کو قبول کیوں نہیں کرتے؟ اس لئے کہ ان کی آنکھوں پر غفلت کا پردہ پڑ چکا ہے۔

وَعَلٰٓى اَبْصَارِهِمْ غِشَاوَةٌ ز (سورۂ بقرہ ۲ : آیت ۷)

جب انسان کے قلب و بصر پر غفلت کا پردہ پڑ جائے تو وہ زیادہ سے زیادہ دنیاوی مال و دولت جمع کرنے کی دُھن میں لگ جاتا ہے۔ اسی طرح حکومت اور اقتدار حاصل کرنے کا خواہش مند، چند روزہ اقتدار کے حصول کی خاطر اپنا سب کچھ گنوا دیتا ہے۔ اس اقتدار کی خاطر وہ طرح طرح کی سختیاں اور زحمتیں برداشت کرتا ہے اس کی اپنی آزادی سلب ہو کر رہ جاتی ہے۔ اس کا راحت اور آرام چھن جاتا ہے۔ یہ سب کچھ وہ اپنی چند روزہ زندگی کو بہتر بنانے کی خاطر کرتا ہے۔ وہ چند روزہ زندگی جس کے بارے میں یقین سے کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ یہ کتنے عرصے تک رہے گی! نہ معلوم کب اسے تختِ سلطنت سے اُٹھا کر تختۂ تابوت میں ڈال دیا جائے گا۔ آخر انسان حصولِ اقتدار و حکومت کے انجام کی بابت کیوں نہیں سوچتا۔ اے انسان کم از کم تو اپنی عمر کے بارے میں جان لے کہ کتنے عرصے تک زندہ رہے گا اس کے بعد اپنی دُنیا کے لئے زحمتیں برداشت کر!

جب انسان کے قلب پر پردہ پڑ جائے تو موت پر سے یقین ختم ہو جاتا ہے۔ وہ تو بالکل جانور کی طرح باعث عبرت بن جاتا ہے۔ کسی شاعر

نے خوب کہا ہے ؎

گرگِ اجل یکایک از این گلہ می برد

این گلہ را نگر کہ چہ آسودہ می چَرد

"موت کا خونخوار بھیڑیا اچانک حملہ آور ہو کر اس گلہ کو لے جائے گا۔ لیکن ذرا اس گلہ کو تو دیکھو کتنی بے فکری سے چر رہا ہے!"

البتہ جب انسان کے قلب پر پڑے ہوئے پردے ہٹ جاتے ہیں تو اس کا دل روشن ہو جاتا ہے۔ وہ حق پہچان لیتا ہے اور اور اسی کا طالب ہوتا ہے اور اس کا مقصد زندگی صرف خوشنودئ خدا کا حصول ہوتا ہے۔ البتہ اس کے لئے قلبی معرفت لازمی ہے۔

کتاب "منیۃ المرید" میں شہید ثانیؒ نے حضرت عیسٰی علیہ السّلام سے یہ حدیث نقل کی ہے۔ حضرت عیسٰیؑ فرماتے ہیں:

لیس العلم فی السّمآء فینزل إلیکم ولا فی الاَرَضِین فیَخرج إلیکُم ولکنہ مجبول فی نفوسکم تادّبوا باداب الرّوحانیینَ تجدوہٗ

"علم و دانش نہ تو آسمان پر ہے کہ تمہارے لئے اترے اور نہ ہی زمینوں کے اندر ہے کہ تمہارے لئے نکلے۔ بلکہ علم و دانش تو تمہارے نفسوں میں چشمہ کی صورت موجود ہے۔ تم روحانیوں کے طور طریقے اپناؤ تو اسے پالو گے۔"

اب ذرا سوچئے کہ اگر یہ پانی کے چشمہ کی صورت میں موجود ہو لیکن

اس کے اندر کوڑا کرکٹ اور خس و خاشاک پڑ جائے تو اس کا کیا انجام ہوگا اسی لئے کہا گیا ہے کہ روحانیوں کے طور طریقے اختیار کرو۔ یعنی اپنے نفس میں موجود اس علمی چشمے کو آلودہ ہونے سے بچاؤ۔ اگر غیر روحانی لوگوں کا طرزِ زندگی اپناؤ گے اور مادی خواہشات میں مبتلا لوگوں کی پیروی کرو گے تو اس روحانی اور معنوی چشمہ پر مادیت کے پردے پڑ جائیں گے۔ اور دل خلوص و بندگی سے خالی ہو جائے گا۔

خلوصِ و بندگی

حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں:

مَنْ اخلص اللہ اربعین صباحا جَرٰی ینابیع الحکمۃ من قلبہ إلیٰ لسانہ وعدۃ الدّاعی

یعنی کہ جو شخص چالیس روز تک خلوص نیت سے فرض بندگی بجا لاتا رہے تو اللہ تعالیٰ اس کے قلب کو علم و دانش کا چشمہ قرار دے دیتا ہے۔ یہ چشمہ اس کی زبان سے جاری ہونے لگتا ہے اور اس طرح ایسے شخص کا شمار خیر کی طرف دعوت دینے والوں میں ہو جاتا ہے۔

آدمی اگر احادیث یاد کر لے قرآن کی تفسیر پڑھ لے اور دوسرے اسلامی احکامات کو بھی کیسٹ ریکارڈر کی طرح محفوظ کر لے اور پھر یہ سب کیسٹ ہی کی طرح دوسروں کو سنائے تو اس کی کوئی قدر و قیمت نہیں ہے۔

قدر وقیمت تو اُس عِلم کی ہے جو انسان کے دل میں راسخ ہو چکا ہو اور پھر دل کی گہرائی سے نکل رہا ہو اور اُس کے آثار ظاہر ہو رہے ہیں جس نے خُدا کی دل سے معرفت حاصل کرلی ہو۔ اور اُسے علم یقین حاصل ہوگیا ہو وہ کبھی بھی خوشنودیٔ خدا کے خلاف کوئی کام نہیں کرسکتا۔ اور اگر کوئی خوشنودیٔ خدا کے خلاف کام کرتا ہوا نظر آئے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ ابھی اس نے علمِ یقین کی حد تک معرفتِ پروردگار حاصل نہیں کی ہے۔ دُعائے ابوحمزہ ثمالی میں ہم پڑھتے ہیں :

الٰهی لَم أعصِكَ حِین عصیتكَ وَأنا بِربوبیّتكَ جاحِدٌ ولاَ لأمرك مُستَخِفٌ ولاَ لِعقوبتك متهاون ولا لعقوبتك متعرّضٌ ولكن خطیئةٌ عرضت وسولت لی نفسی۔

خداوندا! یہ گناہ جو مجھ سے سرزد ہوا ہے کسی سرکشی یا بڑائی کی وجہ سے نہیں ہوا اور نہ ہی میں نے تیرے عذاب کو معمولی سمجھ کر یہ گناہ کیا ہے۔ بلکہ یہ خطا اور لغزش میرے نفس کی وجہ سے ہے۔

اگر انسان کا نفس معرفت پروردگار سے آشنا ہو جائے تو اس کے لئے تنہائی اور محفل دونوں یکساں ہوتے ہیں اور وہ کسی بھی حالت میں خدا کی نافرمانی نہیں کرتا۔ ہمیشہ خدا کو حاضر و ناظر سمجھتا ہے بلاشبہ علم کے مختلف درجات ہیں جہاد بالنفس ضروری ہے۔ جب تک "میں" کا خاتمہ نہیں ہوجاتا انسان پر حجاب باقی رہتا ہے۔ اس "میں" کی وجہ

سے ممکن ہے کہ انسان شیطان کی طرح بن جائے اور کہنے لگے " میں مستقل ہستی ہوں" اور اس طرح وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے خدا کی رحمت سے دُور ہو جائے۔

جہل سے معرفت ممکن نہیں

خدا تک رسائی حاصل کرنے کے لئے علم و آگاہی ضرُوری ہے اور جہل سے معرفت ممکن نہیں ہے۔ ایک شخص جو خود کو مخلوق اور فانی کی حیثیت سے نہ پہچانتا ہو وہ بھلا خدا کی سچّی معرفت کیسے حاصل کر سکتا ہے؟ خود کو مستقل موجود سمجھ لینا درحقیقت اپنے فانی ہونے کو بھُول جانا ہے اور یہ جہل کی پیداوار ہے۔ اگر ہم چاہتے ہیں کہ خدا کی حقیقی معرفت حاصل کریں تو سب سے پہلے ہمیں اپنے نفس سے جہاد کرنا ہوگا یہاں تک کہ "میں" کا خاتمہ ہو جائے۔ اپنی پسند اور ناپسند کا سوال نہ ہو بلکہ ہر حال میں خدا کی پسند مقدم قرار پائے۔ بدترین باطنی شرک یہ ہے کہ انسان اپنے وجود کو اپنی طرف سے سمجھ بیٹھے اور خدا کو فراموش کر دے اسے یہ بھی نہ یاد رہے کہ اس کا اپنا وجود اپنی کسی کوشش کا نتیجہ نہیں ہے۔ بلکہ وہ اور جو کچھ بھی اس کے پاس ہے سب اللہ ہی کا دیا ہُوا ہے۔ اس حد تک خدا پر ایمان رکھنا لازمی ہے۔

خدا سے دُعا کرنی چاہیئے کہ پروردگارا مجھے چیزوں کی صحیح حقیقت

سے اسی طرح آشنا فرمادے جیسی وہ ہیں۔" ارنی الاشیاء کما ھی" خداوندا! میرے دل پر جو پردے پڑ چکے ہیں اُسے ہٹادے۔ میرا نفس عیب دار ہو چکا ہے۔ اس عیب کو دُور فرمادے، میری عقل پر خواہشات غالب آچکی ہیں ان خواہشات کو مجھ سے دُور کردے:" الٰھی قلبی محجوبٌ ونفسی معیوبٌ وعقلی مغلوبٌ وھوائی غالبٌ" اپنی ان خواہشات سے کہیں اور فرار ممکن نہیں بلکہ صرف خدا کی طرف فرار ممکن ہے۔ سورۂ ذاریات کی آیت نمبر ۵۰ میں خداوند عالم حکم دیتا ہے کہ تم خدا ہی کی طرف بھاگو۔" ففرّوا الی اللہ۔"

شک اثر انداز نہیں ہونا چاہیئے

اللہ تعالیٰ کی وحدانیت پر یقین حاصل ہو جانے کے بعد اس پر شک اثر انداز نہیں ہونا چاہیئے۔ کائنات کا ذرّہ ذرّہ وجودِ خدا کا پتہ دیتا ہے۔ انسان کو چاہیئے کہ موجودات عالم کا گہری نظر سے مشاہدہ کرے یہ تمام چیزیں اس کے لئے خدا کو دیکھنے کا آئینہ ثابت ہوں گی۔ اس جہانِ ہستی کو" عالم" کہتے ہیں کیونکہ اس کے ذریعے" یعلم بہ اللہ" یعنی اللہ تعالیٰ کا علم حاصل ہوتا ہے۔

سارا عالم، کتابِ خدا ہے ان لوگوں کے لئے جن کے قلب و رُوح روشن ہوں۔ پھر سارا عالم اور تمام موجودات اپنے خالق کا پتہ

دیتے ہیں۔ اس کی ہستی کے گواہ ہیں۔ خوب یاد رکھنا چاہیئے کہ محض عقلی دلیلوں سے خدا کی معرفت حاصل نہیں ہو سکتی بلکہ کمال کی منزل تک پہنچنے کیلئے ان عقلی دلیلوں سے صرف مدد حاصل کی جا سکتی ہے۔ کیونکہ ان دلیلوں کے ذریعے زیادہ سے زیادہ گمان حاصل ہو سکتا ہے اور یقین کی منزل ابھی بہت دُور ہوتی ہے۔ آدمی کو کوشش کرنی چاہیئے کہ وہ علم و یقین کی منزل تک رسائی حاصل کرے۔ جس کا لازمی نتیجہ سکون اور اطمینان قلب کی صُورت میں ظاہر ہوتا ہے اور وہاں کسی قسم کا شک و شُبہ باقی نہیں رہتا اس منزل تک پہنچنے کے بعد بھی رکنا نہیں چاہیئے بلکہ مزید آگے بڑھتے رہنا چاہیئے۔ کائنات کی ایک ایک شئے کو دیکھ دیکھ کر انسان کے ایمان کو فروغ حاصل ہوتا ہے۔

آئینہ دیکھنا

یہ یاد رہے کہ کسی بھی شئے کو دو طرح سے دیکھا جاتا ہے یہاں آئینے کی مثال لے لیجئے۔ ایک تو خود آئینہ کو خریدنے کی غرض سے دیکھنا اور دوسرے آئینہ میں اپنی شکل دیکھنا۔

جب انسان خود آئینہ کو دیکھتا ہے تو اس وقت اس کی توجہ آئینہ کے چھوٹے یا بڑے ہونے اس کی ظاہری خوبصورتی، اور اس کے شیشے کی نوعیت کی طرف ہوتی ہے۔ ہاں! خریدتے وقت انہی چیزوں کو ملحوظ رکھا جاتا ہے۔ اس وقت آئینہ میں صُورت دیکھنا مقصود نہیں ہوتا

دوسری صورت میں جب آدمی آئینہ دیکھتا ہے تو اس کا مقصد صرف اپنی صورت دیکھنا ہوتا ہے اور خود آئینہ کو دیکھنا مقصد نہیں ہوتا۔

اسی طرح جب کوئی شخص موجوداتِ عالم پر نظر ڈالتا ہے اور اسکا مقصد صرف ان اشیاء کا دیکھنا ہوتا ہے، ان سے لگاؤ ہوتا ہے، اُن کی کشش سے متاثر ہوتا ہے تو اُسے خدا نظر نہیں آتا۔ لیکن جب کوئی شخص موجودات عالم کو عبرت اور نصیحت حاصل کرنے کی غرض سے دیکھتا ہے اور اس کا مقصد یہ چیزیں نہیں ہوتیں تو وہ ان کے ذریعے سے خدا کی معرفت حاصل کرلیتا ہے اور اسے بصیرت حاصل ہو جاتی ہے۔ حضرت علی علیہ السلام اسی بات کو یوں بیان فرماتے ہیں۔

"مَن اَبْصَرَ بِها بصّرته و من ابصر الیها اعمته" (نہج البلاغہ خطبہ نمبر ۸۲)

مولائے کائنات کے اس جملے میں لفظ "بھا" اور "الیھا" غور طلب ہیں۔ یعنی جو دنیا کی ان چیزوں سے مدد لے اور ذریعہ قرار دے اُسے معرفتِ پروردگارِ عالم ہو جاتی ہے اور جو دنیا کی ان چیزوں کی طرف دیکھتا رہ جائے اور اسی کو اپنا مقصد قرار دیدے وہ معرفت سے بے بہرہ اور اندھا ہو کر رہ جاتا ہے۔

دنیا کی محبت، مال و دولت کی طلب، خواہشاتِ نفسانی کی پیروی، ہر قسم کی پابندیوں سے آزادی اور گناہوں کا ارتکاب یہ سب معرفتِ پروردگار کی راہ میں بڑی رکاوٹیں ہیں۔ جب آدمی کوئی بھی گناہ کرتا

ہے تو اس کی چشمِ بصارت پر گویا کہ ایک تیر لگ جاتا ہے۔ حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام فرماتے ہیں:

اَلنَّظْرَۃُ سَھْمٌ مِنْ سِھَامِ اِبْلِیْسَ مَسْمُوْمٌ

(سفینۃ البحار، جلد ۲، صفحہ ۵۹۶)

یعنی: "حرام کی ہوئی چیز پر نظر ڈالنا، ابلیس لعنہ کے زہر آلود تیروں میں سے ایک تیر ہے۔"

مختصر یہ کہ گناہ کی وجہ سے قلب و نظر پر تاریکیاں چھانے لگتی ہیں اور جب پورے دل پر تاریکیوں کے بادل چھا جائیں تو آدمی واضح حقیقتوں کو فراموش کر دیتا ہے۔ ارشادِ ربّ العزّت ہے:

ثُمَّ كَانَ عَاقِبَةَ الَّذِيْنَ اَسَاۗءُوا السُّوْۗآٰى اَنْ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَكَانُوْا بِهَا يَسْتَهْزِءُوْنَ (سورہ روم ۳۰: آیت ۱۰)

یعنی: "پھر جن لوگوں نے گناہ اور برائیوں کا ارتکاب کیا تھا ان کا انجام بُرا ہی ہوا کیونکہ ان لوگوں نے واضح نشانیوں تک (یعنی وجودِ خدا) کو جھٹلایا' اور ان کے ساتھ مسخرا پن کیا کرتے تھے۔"

اب جو شخص بھی سعادت کا خواہاں ہے اسے گناہوں سے بچنا چاہیئے اور اگر کبھی اتفاقاً کوئی گناہ سرزد ہو جائے تو فوراً توبہ کر لینی چاہیئے۔ یہ کہتے ہوئے:

اَللّٰھُمَّ اجْعَلْنَا مِنَ التَّوَّابِیْنَ وَاجْعَلْنَا مِنَ الْمُتَطَھِّرِیْنَ ط

یعنی: "خداوندا! ہمیں توبہ کرنے والوں اور گناہوں سے پاکیزگی

اختیار کرنے والوں میں قرار دے۔"

مذکورہ بیانات سے اس سوال کا جواب بھی واضح ہو جاتا ہے کہ وجودِ خدا بعض لوگوں کے نزدیک چمکتے ہوئے سورج کی طرح روشن کیوں ہے؟ جبکہ بعض لوگوں کے نزدیک مبہم اور غیر واضح ہے؟!

جی ہاں، صرف نام لینے سے کوئی خزانہ ہاتھ نہیں آجاتا بلکہ اس کے لئے کوششیں کرنی پڑتی ہیں۔ سختیوں اور دشواریوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ اسی طرح معرفتِ پروردگار کا خزانہ بغیر کوشش اور ریاضت کے حاصل نہیں ہوتا بلکہ اس راہ میں سختیاں برداشت کرنی پڑتی ہیں راہِ حق میں صبر و تحمل سے کام لینا ہوتا ہے اور گناہوں کو چھوڑنا پڑتا ہے تاکہ معرفتِ الٰہی کے عظیم الشان خزانے تک رسائی حاصل ہو جائے۔

فصل - ۳

اہلِ یقین اور بقائے عالم

سُورۂ واقعہ کی آیت ۹۵ اور ۹۶ میں ارشاد باری تعالیٰ ہے:

اِنَّ ھٰذَا لَھُوَ حَقُّ الْیَقِیْنِ ط

"بے شک یہ (خبر) یقیناً صحیح ہے۔"

فَسَبِّحْ بِاسْمِ رَبِّكَ الْعَظِیْمِ ط

"تو (اے رسولؐ) تم اپنے بزرگ پروردگار کی تسبیح کرو۔"

جب تک روئے زمین پر اہلِ یقین اور صاحبان ایمان موجود ہیں یہ عالم باقی ہے اور اس کا نظام قائم ہے۔ دوسرے لفظوں میں عالم کی بقا کا سبب اہلِ یقین ہیں۔ کتاب "کافی" میں ایک باب اس عنوان سے ہے کہ اگر اس دنیا میں صرف ایک مومن بھی رہے تو یہی چیز مقصد خلقتِ کائنات کے حصول کے لئے کافی ہے۔ معلوم ہوا کہ روئے زمین پر مومن کا وجود انتہائی اہم ہے۔

قرآن مجید میں ہے:

اَللّٰهُ الَّذِیْ خَلَقَ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ وَّمِنَ الْاَرْضِ مِثْلَهُنَّ ؕ یَتَنَزَّلُ الْاَمْرُ بَیْنَهُنَّ لِتَعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ ۙ وَّ اَنَّ اللّٰهَ قَدْ اَحَاطَ بِکُلِّ شَیْءٍ عِلْمًا ۟

(سورۂ طلاق ۶۵ آیت ۱۲)

"خدا ہی تو ہے جس نے سات آسمان پیدا کئے اور انہیں کے برابر زمین کو بھی، اُن میں خدا کا حکم نازل ہوتا رہتا ہے تاکہ تم لوگ جان لو کہ خدا ہر چیز پر قادر ہے اور بے شک خدا اپنے علم سے ہر چیز پر حاوی ہے۔"

اس آیۂ شریفہ میں آسمانوں اور زمین کی غرض خلقت، اللہ تعالیٰ کے علم اور قدرت کی معرفت کا حصول بیان کیا گیا ہے۔ اس پر غور کرنے سے اہلِ ایمان و یقین کو مزید اطمینان حاصل ہوگا۔ وہ دل سے خدا کی وحدانیت کی تصدیق کریں اعلیٰ و ارفع مقام تک رسائی حاصل کرلیں۔ ایسا اعلیٰ و ارفع مقام جہاں شکوک و شبہات کا گزر تک نہیں ہوتا اور ان کے ایمان میں معمولی سی بھی لغزش پیدا نہیں ہوتی وہ جنت اور جہنم اور آخرت پر یقین رکھنے والے ہو جاتے ہیں۔ جیسا کہ سورۂ بقرہ کی پانچویں آیت میں ارشاد ہے: " وَبِالْاٰخِرَةِ هُمْ یُوْقِنُوْنَ۔ وہ اپنے ذرہ برابر اعمال کی جزاء و سزا پر مکمل یقین رکھنے والے ہوتے ہیں۔ جیسا کہ سورۂ زلزال کی آٹھویں آیت میں ہے:

فَمَنْ یَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَیْرًا یَّرَهٗ ۝ وَمَنْ یَّعْمَلْ مِثْقَالَ

ذَرَّةٍ شَرًّا یَّرَہٗ یعنی "جس نے ذرہ برابر بھی نیکی کی ہوگی وہ (بروز آخرت) اُسے دیکھ لے گا اور جس نے ذرہ برابر بدی کی ہوگی وہ (بروز آخرت) اُسے دیکھ لیگا"۔

یقین سے مراد دل کا نورِ ایمان سے منور ہوجانا ہے اور اُس کی کوئی اصطلاحی تعریف نہیں ہے۔ بس جس کا دل روشن ہوجائے، شکوک و شبہات کی تاریکی اس سے دُور ہوجائے اور اس میں شرک نہ پایا جاتا ہو، وہی اہلِ یقین ہوتا ہے۔ ایسے ہی علم اور اہلِ یقین بننے کے لئے احادیث میں زور دیا گیا ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں:

اُطلبوا العلم ولو بالصّین (مصباح الشریعہ)

"علم و دانش حاصل کرو خواہ وہ چین ہی میں کیوں نہ ہو" اور حضرتِ علی علیہ السّلام فرماتے ہیں:

النَّاسُ ثَلٰثَۃٌ عَالِمٌ رَبَّانِیٌّ وَمُتَعَلِّمٌ عَلٰی سَبِیْلِ نَجَاۃٍ وَهَمَجٌ رِعَاعٌ (نہج البلاغہ)

"لوگوں کے تین گروہ ہیں: اوّل عالم، دوسرے نجات کے راستے پر رہتے ہوئے علم حاصل کرنے والے (یعنی یقین کے راستے پر گامزن) اور تیسرے بے کار اور فضول لوگ"۔

حضرتِ علیؑ نے لوگوں کے تین گروہ بتائے ہیں: عالم یعنی جو کہ یقین کی منزل تک پہنچ چکا ہو۔ متعلّم یعنی جو یقین کے راستے پر چلنے

کا خواہاں ہو اور اُسے طلب کرے اور ہیچ رعناع یعنی وہ جو بالکل بیکار اور فضول ہو۔ جس کے سر میں دُنیا کا سودا سما گیا ہو وہ خدا کے بارے میں کچھ نہیں سوچتا بس اس کی تمام تر کوششوں کا محور دنیا ہی ہوتی ہے

مختصر یہ کہ اہلِ یقین بہت کم ہیں۔ اور اگر کسی شہر میں ایک بھی اہلِ یقین ہو تو اس کی برکت سے آسمانی برکتیں نازل ہوتی ہیں، بلائیں دُور ہو جاتی ہیں۔ عالم کو ایسے افراد کے لئے خلق کیا گیا ہے۔ ایسے ہی ایک اہلِ یقین کے واقعہ کو بطور مثال ملاحظہ فرمایئے۔

جناب دانیال اور شیر

جناب دانیال کے حالات زندگی میں ملتا ہے کہ ایک مرتبہ بخت النصر نے آپ کو گرفتار کر لیا۔ اور قتل کرنے کے لئے ایک گہرے کنویں میں خوفناک شیر چھوڑ کر آپ کو اس میں ڈالنے کے بعد یہ حکم دیا کہ کنویں کے بالائی حصّے کو کسی چیز سے ڈھانک کر بند کر دیا جائے۔ چنانچہ ایسا ہی کیا گیا۔ حضرت دانیال، شیر کے ساتھ اس کنوئیں میں بند کروا دیئے گئے۔ کسی کو بھی اس کنوئیں کے قریب جانے کی اجازت نہیں تھی۔

اللہ تبارک و تعالیٰ نے اس زمانے کے ایک پیغمبرؑ پر وحی نازل فرمائی فلاں مقام پر کھانا لے کر جاؤ۔ وہ پیغمبرؑ کھانا لے کر وہاں پہنچے، کنوئیں کے ایک کنارے کو شگافتہ کیا دیکھا کہ کنوئیں کے اندر شیر بڑے ادب سے حضرت دانیال کے سامنے بیٹھا ہے۔ جب کھانا دانیال کو

پہنچایا تو انہوں نے کہا۔ "اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ الَّذِیْ لَا یَنْسٰی مَنْ شَکَرَہٗ
یعنی: "تمام تعریفیں اس خدا کے لئے ہیں جو اپنا شکر ادا کرنے والے بندے کو فراموش نہیں کرتا۔ (حیوٰۃ القلوب جلد ۱: صفحہ نمبر ۲۶۴)

اگر حضرت دانیال یقین کی دولت سے مالا مال نہ ہوتے تو شیر دیکھتے ہی بے ہوش ہو کر اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھتے۔ لیکن وہ اہلِ یقین میں سے تھے۔ اس بات پر ایمان رکھتے تھے کہ شیر بھی خدا کی عاجز مخلوق ہے اور وہ مشیتِ پروردگار کے بغیر کچھ نہیں کر سکتا۔

دُنیا کی سختیاں

دُعائے نیمۂ شعبان میں ہم پڑھتے ہیں:

وَمِنَ الْیَقِیْنِ مَا یَھُوْنُ عَلَیْنَا بِہٖ مُصِیْبَاتُ الدُّنْیَا

"بارِ الٰہا! مجھے ایسا یقین عنایت فرما جس کی برکت سے مجھ پر دنیا کی سختیاں آسان ہو جائیں۔"

معلوم ہوا کہ جب انسان کے قلب میں نورِ یقین پیدا ہو جاتا ہے تو اس پر دنیا کی سختیاں آسان ہو جاتی ہیں۔ کیونکہ وہ اس بات پر یقین رکھتا ہے کہ جن چیزوں کا بھی اُسے سامنا کرنا پڑتا ہے وہ سب ایک مقدر شدہ فیصلے کے مطابق ہیں اور انھیں میں اس کی بھلائی ہے یہی سوچ کر اُسے ایک قسم کا اطمینان حاصل ہو جاتا ہے اور دنیا کی مصیبتیں اس کے سامنے کوئی حقیقت نہیں رکھتیں۔

دُعا کے اس جملے سے ضمناً یہ بھی ثابت ہوجاتا ہے کہ ایمان اور یقین، عطیۂ خداوندی ہے۔ کتاب "کافی" میں ہے کہ "ایمان" اللہ کی جانب سے ہبہ ہوتا ہے۔ مذکورہ کتاب میں اس عنوان سے ایک پورا باب موجود ہے۔ البتہ ایمان کے اللہ کی طرف سے ہبہ ہونے کا مطلب یہ نہیں کہ انسان کوئی کوشش نہ کرے بلکہ اُسے چاہیئے کہ تحصیلِ ایمان کے لئے مسلسل کوشش کرتا رہے تاکہ خداوندِ عالم اُسے ایمان ویقین کی زیادہ سے زیادہ دولت عطا فرمائے۔

ایمان میں اضافہ

علمِ عقائد میں اس موضوع پر کافی بحث موجود ہے کہ کیا ایمان میں اضافہ ہوسکتا ہے یا نہیں؟ اس بحث کے بعد محققین کرام ظاہرِ آیاتِ قرآنی اور روایات کی روشنی میں اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ ایمان میں کمی اور زیادتی واقع ہوسکتی ہے جیسا کہ سورۂ انفال کی دوسری آیت میں ارشادِ ربّ العزت ہے:

وَاِذَا تُلِيَتْ عَلَيْهِمْ اٰيٰتُهٗ زَادَتْهُمْ اِيْمَانًا

"اور جب ان کے سامنے اس کی آیتیں پڑھی جاتی ہیں تو ان کے ایمان کو اور بھی زیادہ کردیتی ہیں"

اس آیۂ مبارکہ سے بخوبی واضح ہوجاتا ہے کہ ایمان میں اضافہ ہوسکتا ہے تو اس میں کمی کا امکان بھی رہتا ہے۔ محقق طوسیؒ فرماتے ہیں:

ایمان کا تعلق دو چیزوں سے ہوتا ہے۔ ایک کسی شئے پر یقین اور دوسرے اُس کی مخالف صورت نہ ہونے پر یقین۔ اور اگر انسان سے بلند منزل کی طرف رواں دواں ہو تو یہ انکشافِ شئی ہے۔ انکشافِ شئی یعنی کسی چیز کا اس طرح واضح ہو جانا کہ اس میں کوئی شک نہ پایا جاتا ہو۔ ایمان کی یہ اعلیٰ منزل ہر شخص کو نصیب نہیں ہوتی۔ ایک عام آدمی کے ایمان و یقین، اور حضرت سلمان فارسیؓ کے ایمان و یقین میں فرق پایا جاتا ہے۔ یہی نہیں بلکہ کتب احادیث اور صحیفۂ سجادیہ کی روشنی میں واضح ہو جاتا ہے کہ انبیاء علیہم السّلام کے ایمان و یقین کے مختلف درجات ہیں۔ "بحار الانوار" میں حضرت امام جعفر صادقؑ سے بھی یہی کچھ مروی ہے۔

یقین کے درجات

یقین کے مختلف درجات ہوتے ہیں۔ کتاب "مصباح الشریعہ" میں ہے کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے لوگوں نے کہا: حضرت عیسیٰ ابن مریمؑ پانی پر چلا کرتے تھے۔ آنحضرتؐ نے فرمایا: اگر ایمان کا یقین اور قوی ہوتا تو وہ ہوا پر بھی چل سکتے تھے۔ کہاں حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ کا یقین اور کہاں دوسروں کا یقین! حضرت ابراہیمؑ نے بارگاہِ خداوندی میں عرض کیا "پروردگارا مجھ کو دکھا دے کہ تو کس طرح مردوں کو زندہ کرتا ہے؟" ارشادِ ربّ العزّت ہوا: "کیا تم ایمان نہیں لائے؟" حضرت ابراہیمؑ نے کہا "ایمان

لے آیا ہوں لیکن مزید اطمینان حاصل کرنے کے لئے میرا دل چاہتا ہے کہ آنکھوں سے دیکھوں۔"

اپنے یقین کے بارے میں حضرت علیؑ فرماتے ہیں: "اگر تمام پردے ہٹا دیئے جائیں تب بھی میرے یقین میں کوئی اضافہ نہیں ہوگا۔" اس سے ہم حضرت امیرالمومنینؑ اور حضرت ابراہیمؑ کے یقین کی منزلوں اور مختلف درجات کا اندازہ کر سکتے ہیں۔ خاتم الانبیاءؐ یقین کے سب سے بلند درجے پر فائز ہیں اور اس کے بعد آپؐ کے بارہ جانشین یقین کی اعلیٰ درجے پر فائز ہیں۔

مختصر یہ کہ ایمان اور یقین کے کئی درجات ہیں اور ان میں کمی اور زیادتی کا امکان بھی پایا جاتا ہے۔ ان میں تغیر و تبدل بھی ہو سکتا ہے۔ ممکن ہے صبح کے وقت آدمی کے ایمان کی کیفیت کچھ ہو لیکن شام کے وقت اس سے مختلف ہو۔ کبھی ایسا ہوتا ہے کہ ایمان کامل سے کامل تر ہوتا چلا جاتا ہے اور عمر کے آخری حصے میں اتنا مضبوط اور محکم ہو جاتا ہے کہ تند و تیز طوفانی ہوا کے جھونکے بھی ایمان کے اس نور کو نہیں بجھا سکتے، لیکن اس کے برعکس کبھی ایسا بھی ممکن ہے کہ بعض اسباب کی وجہ سے ایمان میں کمی واقع ہوتی چلی جائے۔

کارِ خیر سے ایمان میں اضافہ

کارِ خیر سے ایمان اور یقین میں اضافہ ہوتا ہے۔ جب انسان خلوصِ نیت کے ساتھ خدا کی بندگی کرتا ہے تو اس کا ایمان بڑھتا چلا جاتا ہے۔ نماز،

روزہ، ذکرِ الٰہی، تلاوتِ قرآن، راہِ خدا میں مال خرچ کرنا، برادر مومن کی حاجت کو پورا کرنا کارِ خیر ہیں۔ مختصر یہ کہ ہر وہ کام جس میں خوشنودی خدا کے علاوہ اور کوئی غرض نہ ہو ایمان میں اضافے کا باعث ہوتی ہے۔ للہ فی اللہ اچھے لوگوں کی صحبت میں بیٹھنا اور صاحبانِ یقین کے ساتھ رہنا بلاشبہ ایمانی قوت کو پختہ کر دیتا ہے۔

اس کے برعکس گناہوں کا ارتکاب کرنے بلکہ مکروہ کام کرنے سے بھی ایمان میں کمی واقع ہوتی ہے حالانکہ بہت سے لوگ مکروہ فعل کو یہ سمجھ کر کرتے رہتے ہیں کہ اس سے نورِ ایمان میں کوئی فرق نہیں پڑتا۔ جبکہ اس کی تائید میں حضرتِ یوسف علیہ السلام کا یہ واقعہ پیش کیا جا سکتا ہے جو کتاب "کافی" میں موجود ہے۔

حضرت یوسفؑ کی ہتھیلی کا نور

حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے مروی ہے کہ حضرت یوسفؑ نے اپنے والد حضرت یعقوبؑ اور اپنے بھائیوں کو مصر آنے کی دعوت دی۔ جب حضرت یعقوبؑ مصر کے قریب آئے تو جناب یوسفؑ جو مصر کے بادشاہ ہو چکے تھے چند فرسخ ان کے استقبال کے لئے آگے بڑھے۔ یہاں تک کہ بالکل قریب پہنچ گئے لیکن اپنی ظاہری سلطنت و حکومت کی وجہ سے اپنے ضعیف العمر والد کا پوری طرح احترام نہ کر سکے۔ مناسب تو یہ تھا کہ خود گھوڑے

سے اُتر جاتے لیکن بہر حال اُن ؑ سے یہ ترکِ اولیٰ ہو گیا (ترکِ اولیٰ یعنی انہوں نے کوئی ناجائز کام نہیں کیا تھا بلکہ ایک چیز جو بہتر تھی اور اسے بجالانا چاہیئے تھا بجا نہ لاسکے۔)

اس ترکِ اولیٰ کا سرزد ہونا تھا کہ جبرئیل ؑ ان پر نازل ہوئے اور کہا: "اپنے ہاتھ کی ہتھیلی دیکھو؟ جب حضرت یوسف نے ہتھیلی پر نظر ڈالی تو دیکھا کہ ان کے ہاتھوں میں پایا جانے والا نور ہاتھ سے نکل چکا ہے!" حضرت جبرئیل علیہ السلام نے فرمایا: "اسی کام (ترک اولیٰ) کی وجہ سے نورِ نبوت آپ کی نسل سے نکل گیا ہے۔" یہی وجہ ہے کہ جناب یوسف ؑ کی نسل سے کوئی پیغمبر نہیں ہوا۔"

ذرا غور فرمایئے کہ جب ایک ترکِ اولیٰ کا طبعی طور پر اتنا گہرا اثر پڑتا ہے تو مکروہ اور حرام کا کتنا بُرا اثر پڑتا ہے! ہر شخص کو چاہیئے کہ خود اپنا جائزہ لے اور کوئی ایسا فعل نہ سرزد ہونے دے جو ایمان میں کمی کا باعث ہو۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ موت کے وقت شیطان ایمان کا خاتمہ کردے بلکہ اپنے آپ کو گناہوں سے محفوظ رکھتے ہوئے ایمان کو اتنا مضبوط بنانا چاہیئے کہ جب وقت آخر شیطان بہکانے کے لئے قریب آئے تو اُسے ذلیل و خوار ہو کر مایوس لوٹنا پڑے۔

قرآن مجید کی آیتیں شاہد ہیں کہ وہ لوگ جو گناہ کرتے ہیں، آیاتِ خدا کی تکذیب کرتے ہیں اور ان کا مذاق اڑاتے ہیں تو اس طرح پے در پے اور کثرت سے گناہ کرنے کی وجہ سے اور توبہ نہ کرنے کے باعث ان کا دل ایمان

سے خالی ہو جاتا ہے۔

اے خوف زدہ لوگوں کو امن و قرار دینے والے خدا! اے امن و امان فراہم کرنے والے اور پناہ دینے والے پروردگار! ہم تیری ہی پناہ چاہتے ہیں۔ انسان جب اپنی زندگی کے آخری لمحات کے بارے میں سوچتا ہے تو اس کی کیا حالت ہو جاتی ہے! وقتِ آخر اپنے ایمان کی حفاظت کے لئے دعائے عدیلہ پڑھنا چاہیئے۔ وہ جس میں بندہ اپنا ایمان خدا کے سپرد کرتے ہوئے یہ کہتا ہے: پروردگارا! میں اپنا ایمان تیرے سپرد کرتا ہوں۔ موت کے ہنگام میرا ایمان مجھے لوٹا دینا۔ اس لئے کہ اَنْتَ خَیْرُ مُسْتَوْدَعٍ (یعنی: تو سب سے بہتر امانتدار ہے) کم از کم کوئی تو ایسا دروازہ ہو جہاں سے علاج ہو سکے۔ کیسا بھی درد ہو دوا وہاں سے مل جاتی ہے۔ اگر خوف و خطر لاحق ہو جائے تو وہاں سے لطف و کرم مل جاتا ہے البتہ کوئی مانگے تو سہی۔ سچے مانگنے والے اور خدا کی بارگاہ میں صدقِ دل سے رجوع کرنے والے کتنے کم ہیں۔؟!

بغض و عناد کا خاتمہ

معمولی باتوں سے متاثر ہو کر آپس میں بغض و عناد اور حسد آخر کیوں؟ بہت کم لوگ ایسے ہیں جن کے دل بغض و عناد سے خالی ہوں۔ اس کی اصل وجہ دل کا یقین کی دولت سے محروم ہونا ہے۔ حضرت علی علیہ السّلام فرماتے ہیں کہ کم از کم انسان کو اس بات کا یقین ہونا چاہیئے

کہ تمام کام خدا کے قبضۂ قدرت میں ہیں (اور مشیّتِ پروردگار کے بغیر کچھ نہیں ہوتا) تو پھر اپنے مدّ مقابل اور دشمن کی ترقی پر جلنا اور کڑھنا کیسا؟ اس کا غم کھا کر گھلنا کیسا؟ پھر اس کے بعد یقین کی وہ راسخ منزل بھی آجانی چاہیئے۔ جب انسان کا اس پر پختہ یقین ہو کہ چھوٹا بڑا ہر کام خدا کے ہاں مقدّر ہو چکا ہے۔ ایسے ہی یقینِ صادق کی دعائے "ابو حمزہ ثمالی" میں یوں خواہش کی گئی ہے۔ وَیَقِیْناً صَادِقًا حَتّٰی اَعْلَمَ اَنَّہٗ لَنْ یُصِیْبَنِیْ اِلَّا مَا کَتَبْتَ لِیْ۔ خُداوندا! مجھے ایسا یقین صادق عطا فرما کہ میں اچھی طرح سمجھ لوں کہ جو کچھ تو نے میرے لئے لکھ دیا ہے۔ اس کے علاوہ کچھ اور مجھے نہیں مل سکتا۔"

جب ہم نے اچھی طرح جان لیا کہ نفع اور نقصان خدا کے ہاتھ میں ہے اور اگر وہ کسی کو فائدہ پہنچانا چاہے تو کوئی اُسے نہیں روک سکتا اور اگر وہ کسی کو نقصان پہنچانا چاہے تو کوئی اُسے روک نہیں سکتا۔ جیسا کہ سُورۂ یونس کی آیت ۱۰۷ میں ارشاد پروردگار ہے:

وَ اِنْ یَّمْسَسْكَ اللّٰهُ بِضُرٍّ فَلَا كَاشِفَ لَهٗۤ اِلَّا هُوَ ۚ وَ اِنْ یُّرِدْكَ بِخَیْرٍ فَلَا رَآدَّ لِفَضْلِهٖ

"اور (یاد رکھو) اگر خدا کی طرف سے تمہیں کوئی برائی چھو بھی گئی تو اس کے سوا کوئی اس کا دفع کرنے والا نہ ہوگا اور تمہارے ساتھ بھلائی کا ارادہ کرے تو پھر اس کے فضل (وکرم) کا پلٹنے والا بھی کوئی نہیں۔"

اب اس آیت کی روشنی میں ذرا سوچیئے اور غور کیجئے کہ اگر آپ کا

دشمن ترقی کر گیا تو اس میں جلنے اور کڑھنے کی کیا بات ہے۔ کیا حسد کرنے کی وجہ سے اس کی ترقی رک جائے گی ؟! اور جب خدا کسی بندے پر اپنا فضل و کرم کرنا چاہتا ہے تو کیا کوئی اس کی راہ میں حائل ہو سکتا ہے ؟

ایمان کا دوسرا درجہ

حضرت علی علیہ السلام ایک مقام پر ایمان کامل کے چار بنیادی ارکان کا تذکرہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ پہلا رکن صبر، دوسرا یقین تیسرا عدل اور چوتھا جہاد ہے۔ صبر کے بارے میں گفتگو کی جا چکی ہے۔ آج ایمان کے اس دوسرے درجے یقین کا تذکرہ ہوگا۔ ایمان یقین پر موقوف ہے، جب تک کوئی یقین کی منزل تک رسائی حاصل نہ کرے، صاحبِ ایمان نہیں ہو سکتا یعنی ایسا ایمان جو اطمینانِ قلب کا باعث ہو اور جس سے اضطراب و لغزش کا خاتمہ ہو جائے بغیر یقین کے حاصل نہیں ہو سکتا۔

یقین کے کیا معنی ہیں، اس کے کتنے درجات ہیں، اس سے کیا اثرات ظاہر ہوتے ہیں اور کس طرح اپنے یقین میں اضافہ کیا جا سکتا ہے، ان سب کی تفصیلات جاننے کے لئے کتاب "قلبِ سلیم" کا مطالعہ فرمائیے

یقین برقرار رہتا ہے

یقین کے معنی علمائے کرام نے یوں بیان کئے ہیں کہ "کسی شئے پر

اس کی حقیقت کے مطابق پختہ اعتقاد کا نام یقین ہے۔" مطلب یہ ہوا کہ ہر وہ اعتقاد جو بالکل دُرست ہو، حقیقت کے عین مطابق ہو اور اپنی جگہ پر برقرار رہے تو اُسے یقین کہا جائے گا۔ مثلاً آپ لوگوں میں بہت سے ایسے ہوں گے۔ جو مکہ معظمہ نہیں گئے ہوں گے۔ لیکن اس شہر مقدس کے بارے میں اتنا سُنا ہے، اتنا سُنا ہے کہ اب آپ کبھی بھی اس شہر کے وجود سے انکار نہیں کر سکتے۔ گویا یہ ایسا اعتقاد ہے جس کا ختم ہو جانا محال ہے اور ایسے برقرار رہنے والے اعتقاد کو یقین کہا جاتا ہے۔

صحیح ہے پختہ یقین بہت کم پایا جاتا ہے۔ آدمی، خدا، قیامت آخرت کے حساب کتاب، جنّت اور جہنّم پر اگر یقین رکھتا ہے تو اب اسے اپنے عقیدے پر برقرار رہنا چاہیئے۔ اگر کسی مقام پر وہ اپنے ان عقائد حقہ پر برقرار نہ رہ پائے یا شک و تردّد میں مبتلا ہو جائے تو اس سے اندازہ ہو جائے گا کہ ابتداء ہی میں وہ یقین کی منزل پر نہیں تھا! اس لئے کہ یقین میں شک و تردّد کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

قرآن مجید کی بعض سورُوں میں لفظ "علم الیقین"، "عین الیقین" اور "حق الیقین" آیا ہے۔ بعض علماء نے یقین تقلیدی کو ابتدائی مرحلے میں بیان کیا ہے۔ یقین کے ان تمام مراحل کی تفصیلات کا منبر سے بیان کرنا عام لوگوں کے لئے فائدہ مند نہیں ہے لہٰذا ہم اس سے گریز کر رہے ہیں۔ ویسے بھی اس موضوع کی تفصیلات کے خواہاں کم ہیں اور عام لوگوں کا ظنِ قوی بھی کافی ہے۔

ظنّ قوی

شیخ انصاریؒ ظنّ قوی کی بحث میں فرماتے ہیں:

بظاہر دلیلوں سے سمجھ میں آتا ہے کہ ہر مکلّف کے لئے "علم یقین" تک رسائی حاصل کرنا واجب ہے۔ لیکن چونکہ ایسی صورت میں سخت دشواری اور زحمت (عسر و حرج) ہے اور دوسری دلیلوں سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اہلِ یقین بہت کم ہیں۔ یہاں تک روایتوں میں ملتا ہے کوئی بھی چیز یقین سے زیادہ کم یاب نہیں ہے اور امّت مسلّمہ میں اہلِ یقین "کبریت احمر" (سُرخ گندھک یا یاقوت) کی طرح نایاب ہیں۔ لہٰذا شیخ انصاریؒ فرماتے ہیں کہ اگر اطمینان کی حد تک پہنچانے والا ظن بھی حاصل ہو جائے تو یہی کافی ہے۔ کم از کم اس حد تک تو اطمینان ہونا چاہیئے کہ اس میں شاید اور اگر وغیرہ کا کوئی دخل نہ ہو۔ موت، قبر کے سوال و جواب جنّت و جہنّم اور پلِ صراط پر اطمینان رکھتا ہو۔ اس طرح نہ کہے کہ اگر یہ خبر صحیح ہوئی تو قیامت اور حساب و کتاب ہوگا! اور شاید یہ سب کچھ پیش آئے گا۔ یہ "شاید" اور "اگر" انسان کو کفر کی حدود میں پھینک دیتا ہے۔ اتنا عقیدہ تو ہونا چاہیئے کہ اگر سب کے سب تمہارے خلاف اُٹھ کھڑے ہوں تب بھی تم اپنے عقیدے پر باقی رہو۔

انسان یقین کی منزل آسانی سے حاصل نہیں کر سکتا لیکن ظنّ قوی کے ذریعے اطمینانِ قلب حاصل کر سکتا ہے۔ سورۂ فتح کی آیت ۴ میں

ارشاد ہے۔ "هُوَ الَّذِیْ اَنْزَلَ السَّکِیْنَةَ فِیْ قُلُوْبِ الْمُؤْمِنِیْنَ
یعنی: "وہ خدا ہی تو ہے جس نے مومنین کے دلوں کو سکون عطا فرمایا":

اگر کوئی شخص ایمان اور اطمینان قلب چاہتا ہے تو اسے چاہیئے کہ خدا سے دعا کرے کہ خداوندا! مجھے اطمینان قلب عطا فرما جس طرح آپ دنیا کے لئے دعا کرتے ہیں اسی طرح ایمان کے لئے دعا کیجئے۔ یہ مال و دولت کیا ہے؟ کم یا زیادہ جو کچھ بھی ہے مقدر میں ہوتا ہے مل کر رہتا ہے۔ افسوس اگر آدمی ایمان کے بغیر رہ جائے! اس میں دنیا و آخرت دونوں کا نقصان ہے۔ آپ اپنے ایمان کی حفاظت کیجئے جو شکوک و شبہات دلوں میں پیدا ہوں۔ ان سے بچنے کے لئے خدا سے پناہ طلب کیجئے۔ دعا کیجئے کہ تمام عقائد اور معارف الٰہی آپ کے دل میں اچھی طرح سے پیدا ہو جائیں۔ اور آپ اس سلسلے میں ساری زندگی سرگرداں نہ رہیں۔ اپنے ذہن سے کام لیجئے۔

ذہانت مومن کیلئے لازمی ہے

حضرت علی علیہ السلام کیا خوب فرماتے ہیں:

وَالْیَقِیْنُ علی اربع شعب تبصرة الفطنة وتاؤل الحکمة ومعرفة العبرة وَسنة الاولین

یقین کے چار حصے ہیں اوّل ذہانت دوسرے حکمت و دانائی،

تیسرے عبرت حاصل کرنا اور چوتھے گزشتہ لوگوں کے اچھے طور طریقے اپنانا۔

حضرت علی علیہ السّلام فرماتے ہیں کہ تم اپنے ایمان کے دوسرے ستون یعنی یقین کو مضبوط بناؤ۔ ذہانت سے کام لو اور دوسرے کے کاموں سے عبرت و نصیحت حاصل کرو۔ فطانت یعنی زیرکی اور ذہانت۔ آپ اپنے دنیاوی کاموں میں کتنی ذہانت و ہوشیاری کا مظاہرہ کرتے ہیں؟ ہر وقت یہی فکر لاحق ہوتی ہے کہ کہیں کوئی آپ سے بازی نہ لے جائے کوئی آپ پر سبقت نہ حاصل کرلے۔

محترم تاجر صاحب! آپ اپنے دنیاوی کاروبار میں کتنے ذہین ہیں؟ کاروبار کے تمام پہلوؤں پر کتنی اچھی طرح غور و فکر کرتے ہیں؟ اور پھر مشورہ کرنے کے بعد کوئی کاروباری معاملہ طے کرتے ہیں۔ اگر اسی طرح آپ انہی احکام اور دینی امور کے سلسلے میں ذہانت سے کام لیں تو بڑی آسانی سے منزل یقین تک پہنچ سکتے ہیں۔ لیکن افسوس دینی معاملات میں ایسا نہیں ہوتا۔ کسی شاعر نے کیا خوب کہا ہے ؎

بہر دنیا موشگافی ای شقی ٭ بہر عقبی کند ذہن و احمقی

یعنی: "اے بدبخت! تو دنیا کے کاموں میں کتنی باریک بینی سے کام لیتا ہے اور آخرت کے معاملات میں کند ذہن اور احمق بن جاتا ہے۔

افسوس کی بات ہے کہ دینی معاملات میں قطعاً یہ خیال نہیں آتا کہ کہیں تم پیچھے نہ رہ جاؤ اور شیطان تم پر غالب نہ آجائے۔ دین کے معاملات

میں کتنی احتیاط سے کام لیتے ہو۔ اور ہمیشہ اسی احتیاط کے پابند رہتے ہو ذرا سوچو تو سہی کہیں شیطان نے ہمتیں خدا سے دُور تو نہیں کر دیا ہے۔ خوب ذہانت سے کام لو۔ ذہانت مُومن کے لئے لازمی ہے۔

یقین اور غور و فکر

یقین اور غور و فکر کے بغیر منزلِ یقین تک رسائی ممکن نہیں ہے۔ کسی کام میں خوب اچھی طرح غور و فکر کرو اور ہونے والے واقعات سے عبرت حاصل کرو۔ اس طرح تم معرفت پروردگار حاصل کر سکو گے اور آخرت پر ایمان پختہ ہو جائے گا۔ اگر اپنے آپ کو غافل اور نادان بنائے نہ رکھو گے تو قرآنِ مجید کی دعوت فکر کو آسانی سے سمجھ لو گے۔ قرآن حکیم نے بنی نوع انسان کو کیا دعوت دی ہے؟ پہلے تو خداوند متعال نے انسان کو عقل عطا کی اور اس کے بعد اس سے کہا کہ تم اس کے ہوتے ہوئے حماقت نہ کرو تم روزانہ اللہ کی کتنی نشانیوں کو دیکھنے کے باوجود اس سے عبرت حاصل نہیں کرتے اور انکار کر دیتے ہو۔ ان نشانیوں کے ذریعہ خدا کو یاد نہیں کرتے ورنہ درخت پتا پتا وحدہٗ لاشریک کہتا ہے۔ کسی شاعر نے کیا خوب کہا ہے۔

برگِ درختان سبز در نظرِ ہوشیار
ہر ورقی دفتری است معرفت کردگار

(یعنی: درختوں کے سبز پتے ہر ہوشیار اور ذہین شخص کے لئے خداوندِ عالم کی معرفت حاصل کرنے کے لئے ایک بڑی کتاب ہیں۔)

ایمان اور یقین کے مراتب

حضرت امام علی رضا علیہ السلام ارشاد فرماتے ہیں:

الایمان فوق الاسلام بدرجۃ والتقوی فوق الایمان بدرجۃ والیقین فوق التقوی بدرجۃ ولم یقسم بین العباد شئی اقل من الیقین۔

"ایمان" اسلام قبول کر کے ایک درجہ بلندی پر پہنچنے کا نام ہے۔ تقویٰ کی منزل ایمان سے ایک درجہ اونچی ہے۔ اور یقین تقویٰ سے ایک درجہ بلند ہے" اور اللہ کے بندوں میں یقین سے زیادہ کم کوئی چیز تقسیم نہیں کی گئی۔ راوی نے امام سے پوچھا" ای شئی الیقین" "یقین کیا ہے" امامؑ نے فرمایا: التوکل علی اللہ والتسلیم الی اللہ والرضا بقضاء اللہ والتفویض الی اللہ۔

اللہ تعالیٰ پر توکل کرنا، اس کے تمام احکامات کے سامنے سر تسلیم خم کر دینا، اس کے ہر فیصلے سے راضی رہنا اور اپنے تمام کاموں کو اُسی کے سپرد کر دینا۔

علامہ مجلسیؒ نے بعض محققین کے اقوال کو نقل کرتے ہوئے اس حدیث کی تشریح کچھ یوں بیان فرمائی ہے! علم و دانش اور بندگی ایک ایسا

گوہر ہے جس کی طرف دعوت تمام دینی کتابوں میں دی گئی ہے، دانشوروں مفکرین اور وعظ و نصیحت کرنے والوں نے اسی کی جانب ترغیب دلائی ہے۔ بلکہ انبیاء علیہم السلام کے بھیجنے اور آسمانی کتابوں کے نازل کرنے مقصد علم و دانش میں اضافہ کرنا اور بندگیٔ پروردگار کی طرف دعوت دینا ہے۔ علم کی عظمت و بزرگی کو ثابت کرنے کے لئے یہ آیۂ مبارکہ ہی کافی ہے

اَللّٰهُ الَّذِیْ خَلَقَ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ وَّمِنَ الْاَرْضِ مِثْلَهُنَّ ؕ یَتَنَزَّلُ الْاَمْرُ بَیْنَهُنَّ لِتَعْلَمُوْۤا اَنَّ اللّٰهَ عَلٰی كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ ۙ وَّ اَنَّ اللّٰهَ قَدْ اَحَاطَ بِكُلِّ شَیْءٍ عِلْمًا ۠

(سورۂ طلاق ۶۵ آیت ۱۲)

یعنی: "خدا وہی تو ہے جس نے سات آسمان پیدا کئے اور انہیں کے برابر زمین بھی، اُن میں خدا کا حکم نازل ہوتا رہتا ہے تاکہ تم لوگ (خوب اچھی طرح) جان لو کہ خدا ہر چیز پر قادر ہے اور بے شک خدا اپنے علم سے ہر چیز پر حاوی ہے۔"

عبادت اور بندگی کی اہمیت کو ثابت کرتے ہوئے ارشاد ہوا:

وَ مَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَ الْاِنْسَ اِلَّا لِیَعْبُدُوْنِ

(سورۂ ذاریات: آیت ۵۶)

یعنی: "میں نے جنوں اور انسانوں کو نہیں پیدا کیا مگر اس لئے کہ وہ سب میری عبادت کرتے رہیں۔"

یاد رکھنا چاہیئے کہ علم و عبادت ایک دُوسرے کے لازم و ملزوم ہیں

کیونکہ علم ودانش کی وجہ سے عبادت میں اضافہ ہوتا ہے اور عبادت کی وجہ سے علم ودانش میں اضافہ ہوتا ہے یہاں علم ودانش سے مراد دین ہے یعنی معرفت پروردگار حاصل کرنا، اس کے اُصول کو تسلیم کرنا اور اس کی طرف سے نازل ہونے والی کتابوں پر ایمان لانا وغیرہ۔ جیسا کہ سورۂ بقر کی آیت ۲۸۴ میں ارشاد باری تعالیٰ ہے:

اٰمَنَ الرَّسُوْلُ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِ مِنْ رَّبِّهٖ وَالْمُؤْمِنُوْنَ ؕ كُلٌّ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَمَلٰٓئِكَتِهٖ وَكُتُبِهٖ وَرُسُلِهٖ

یعنی: "(ہمارے رسول محمدؐ) جو کچھ ان کے پروردگار کی طرف سے نازل کیا گیا ہے اس پر ایمان لائے اور اُن کے (ساتھ) مومنین بھی (سب کے) سب، خدا، اس کے فرشتوں، اس کی کتابوں اور اس کے رسولوں پر ایمان لائے۔"

اور سورۂ نساء کی آیت ۱۳۶ میں ارشاد ہوا: يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَالْكِتٰبِ الَّذِيْ نَزَّلَ عَلٰى رَسُوْلِهٖ وَالْكِتٰبِ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ مِنْ قَبْلُ ؕ وَمَنْ يَّكْفُرْ بِاللّٰهِ وَمَلٰٓئِكَتِهٖ وَكُتُبِهٖ وَرُسُلِهٖ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًۢا بَعِيْدًا

یعنی: اے ایمان والو! خدا اور اس کے رسولؐ پر اور اُس کتاب پر جو اس نے اپنے رسول (محمدؐ) پر نازل کی ہے اور اس کتاب پر جو اُس نے پہلے نازل کی ایمان لاؤ اور (یہ بھی یاد رہے کہ) جو شخص خدا اور اُس کے فرشتوں اور اس کی کتابوں اور اس کے رسولوں اور روزِ آخرت کا منکر ہوا تو راہ راست

سے بھٹک کر بہت دُور جا پڑا۔"

ایمان کا تعلق علم سے ہوتا ہے۔ جہاں علم ہوگا وہاں ایمان ہوگا۔ اس لئے کہ ایمان کسی چیز کی حقیقت کے مطابق تصدیق کرنے کو کہتے ہیں۔ اور تصدیق کرنے کا مطلب یہ ہوا کہ پہلے آپ اُس شئے کا تصور کریں گے اور اُسی تصور و تصدیق کے مجموعہ کا نام علم ہے۔ ایمان کے مقابلے میں کفر ہے۔ کفر کا مطلب حق کو چھپانا اور اس پر یقین نہ رکھنا ہے۔ اور کفر کا تعلق جہل سے ہوتا ہے۔

شریعتِ مقدسہ میں پانچ چیزوں پر یقین رکھنے کو ایمان قرار دیا گیا ہے۔ وہ پانچ چیزیں یہ ہیں: اللہ تعالیٰ، ملائکہ، آسمانی کتابیں، انبیاءؑ اور روزِ جزا۔ لہٰذا ان پانچ چیزوں پر ایمان رکھنا ہر مُسلمان کے لئے واجب ہے (اس کے علاوہ بارہ ائمہؑ کی امامت پر اعتقاد رکھنا، رسالت پر اعتقاد رکھنے کا جزو ہے۔ کیونکہ نبی پر ایمان کا لازمہ اُن کے وصی پر ایمان رکھنا ہے)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں:

طَلَبُ العِلمِ فَرِیضَۃٌ عَلیٰ کُلِّ مُسلِمٍ وَمُسلِمَۃٍ

"علم حاصل کرنا ہر مسلمان مرد و عورت پر واجب ہے۔"

آنحضرتؐ کے اس ارشادِ گرامی کی روشنی میں جس شخص میں جتنی استطاعت موجود ہو اتنا علم حاصل کرے۔ جیسا کہ سورۂ بقرہ کی آیت نمبر ۲۸۶ میں ارشادِ ربّ العزت ہے:

لَا یُکَلِّفُ اللّٰہُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَھَا (یعنی اللہ تعالیٰ نے کسی بھی

نفس پر اس کی وسعت اور ایمان سے زیادہ ذمہ داری عائد نہیں کی ہے)

علم و ایمان کی کمی اور زیادتی کے اعتبار سے مختلف درجات ہیں۔ اس سلسلے میں بعض افراد بعض پر برتری رکھتے ہیں۔ بہت سی احادیث اس بات پر شاہد ہیں۔ یہ اس لئے کہ ایمان، علم کی نسبت سے ہوتا ہے۔ ایمان ایک نور ہے جو مومن کے دل میں روشن ہوتا ہے۔ جب بندے اور اس کے پروردگار کے درمیان پایا جانے والا پردہ ہٹ جاتا ہے تو دل کی تاریکیاں دور ہوتی چلی جاتی ہیں اور نور بڑھتا چلا جاتا ہے۔ سورۂ بقرہ کی آیت ۲۵۷ میں ارشاد پروردگار ہے اَللّٰهُ وَلِيُّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ۙ يُخْرِجُهُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ ۭ "خدا ان لوگوں کا سرپرست ہے جو ایمان لا چکے کہ انہیں (گمراہی کی) تاریکیوں سے نکال کر (ہدایت کی) روشنی میں لاتا ہے"۔ اسی طرح سورۂ انعام کی آیت ۱۲۲ میں ارشاد ہوا: اَوَمَنْ كَانَ مَيْتًا فَاَحْيَيْنٰهُ وَجَعَلْنَا لَهٗ نُوْرًا يَّمْشِيْ بِهٖ فِي النَّاسِ كَمَنْ مَّثَلُهٗ فِي الظُّلُمٰتِ لَيْسَ بِخَارِجٍ مِّنْهَا "کیا جو شخص (پہلے) مردہ تھا پھر ہم نے اس کو زندہ کیا اور اس کے لئے ایک نور قرار دیا جس کے ذریعہ وہ لوگوں میں (بے تکلّف) چلتا پھرتا ہے اس شخص کا سا ہو سکتا ہے جس کی یہ حالت ہے کہ (ہر طرف سے) اندھیروں میں (پھنسا ہوا) ہے کہ وہاں سے کسی طرح نکل نہیں سکتا"۔

ایمان کا یہ نور بھی دوسرے نور کی طرح کم اور زیادہ ہوتا ہے۔ سورۂ انفال کی دوسری آیت میں خداوند کریم ارشاد فرماتا ہے:

وَاِذَا تُلِيَتْ عَلَيْهِمْ اٰيٰتُهٗ زَادَتْهُمْ اِيْمَانًا

"یعنی: "اور جب ان (مومنین) کے سامنے اس کی آیتیں پڑھی جاتی ہیں تو ان کے ایمان کو اور بھی زیادہ کر دیتی ہیں"

خُدا سے ہمیشہ یہ دعا کرنی چاہیئے کہ

وَقُل رَّبِّ زِدْنِي عِلْمًا سورۂ طٰہٰ ۲۰ : آیت ۱۱۴)

"اے میرے پروردگار میرے علم میں اضافہ فرما"

خوب سمجھ لینا چاہیئے کہ جیسے جیسے انسان کے علم میں اضافہ ہوتا چلا جاتا ہے اس کا دل نورِ ایمان سے منوّر ہوتا چلا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ ایک مرحلہ ایسا بھی آجاتا ہے جب اس کا قلب معرفت سے پُر ہو جاتا ہے۔ وہ ماورائے مادّہ و طبیعت یعنی غیب کی معنوی باتوں کا ادراک کرنے لگتا ہے جو بھی انبیائے کرام نے خبر دی ہے وہ اس پر آشکار ہو جاتی ہے۔ اس کا دل شریعت کے ایک ایک حکم پر عمل کرنے کیلئے خود بخود مائل ہو جاتا ہے۔ یعنی تقویٰ و پرہیزگاری کا ملکۂ نفسانی اسے حاصل ہو جاتا ہے۔ جیسا کہ سورۂ تحریم کی آٹھویں آیت میں اسی کی طرف اشارہ ہے:

نُوْرُهُمْ يَسْعٰى بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَ بِاَيْمَانِهِمْ

یعنی: "اُن کا نور اُن کے آگے آگے اور ان کے داہنے طرف چل رہا ہوگا"

اسی طرح ایک اور مقام پر ارشاد ہوا:

نُوْرٌ عَلٰى نُوْرٍ (سورۂ نور ۲۴ : آیت ۳۵)

یعنی: "نور کے اوپر ایک اور نور (معلوم ہوتا ہے)"

انسان جب صحیح طور پر عبادتِ الٰہی بجالاتا ہے تو اُس کے قلب میں

پاکیزگی پیدا ہوتی ہے۔ اس طرح ایک منزل پر اس کا قلب منوّر ہو جاتا ہے اور معرفت پروردگار سے بھر جاتا ہے۔ پھر یہ نور اسے دوسری عبادتوں کی جانب مائل کرتا ہے۔ اور پھر یہ دوسری عبادات اس کے قلب کو مزید نورانی بنا دیتی ہیں۔ اس طرح قلب میں مزید وسعت پیدا ہو جاتی ہے، معرفت میں اضافہ ہو جاتا ہے اور یقین قوی تر ہو جاتا ہے۔ جیسا کہ آپ نے ملاحظہ فرمایا یہ تمام چیزیں آیاتِ قرآنی کی روشنی میں ثابت ہیں۔

ایمان کا سب سے معمولی درجہ یہ ہے کہ آدمی کا دل شکوک و شبہات میں گھرا ہوا ہو۔ اسی لئے دیہات میں رہنے والے عربوں کے ایمان کے بابت یوں ارشاد ہوا:

قَالَتِ الْاَعْرَابُ اٰمَنَّا ؕ قُلْ لَّمْ تُؤْمِنُوْا وَ لٰكِنْ قُوْلُوْٓا اَسْلَمْنَا وَ لَمَّا يَدْخُلِ الْاِيْمَانُ فِيْ قُلُوْبِكُمْ (سورۂ حجرات: آیت ۱۴)

"عرب کے صحرانشین کہتے ہیں کہ ہم ایمان لائے (اے رسولؐ) کہہ دو کہ تم ایمان نہیں لائے بلکہ (یوں کہو) کہ اسلام لائے حالانکہ ایمان کا تو ابھی تک تمہارے دلوں میں گزر ہی نہیں ہوا۔"

مومن کی شان قرآن مجید نے یوں بیان کی ہے:

اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ اِذَا ذُكِرَ اللّٰهُ وَجِلَتْ قُلُوْبُهُمْ وَ اِذَا تُلِيَتْ عَلَيْهِمْ اٰيٰتُهٗ زَادَتْهُمْ اِيْمَانًا وَّ عَلٰى رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُوْنَ ۚ (سورۂ انفال ۸: آیت ۲)

سچے مومنین تو بس وہی ہیں کہ جب (ان کے سامنے) خدا کا

ذکر کیا جاتا ہے تو ان کے دل دہل جاتے ہیں اور جب ان کے سامنے اس کی آیتیں پڑھی جاتی ہیں ان کے ایمان کو اور بھی زیادہ کر دیتی ہیں اور وہ لوگ بس اپنے پروردگار ہی پر بھروسہ رکھتے ہیں۔"

ایمان واقعی یہ ہے کہ اس کے بعد دل میں کسی قسم کا شک باقی نہ رہے۔ سورۂ حجرات کی پندرھویں آیت میں ارشاد ہوا: اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ثُمَّ لَمْ یَرْتَابُوْا

یعنی: "مومن تو بس وہی ہیں جو خدا اور رسول پر ایمان لائے پھر انہوں نے اس میں کسی طرح کا شک و شبہ نہ کیا۔"

ایمان کا آخری درجہ یہ ہے کہ دل میں شکوک و شبہات سے پاک ہو جائے۔ البتہ شرحِ صدر اور کشف و شہود کی منزل یہ ہے کہ مومن خداوند ذوالجلال والاکرام کی محبت اپنے دل میں کچھ اس طرح پیدا کر لیتا جیسا کہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے: فَسَوْفَ یَاْتِی اللّٰهُ بِقَوْمٍ یُّحِبُّهُمْ وَ یُحِبُّوْنَهٗۤ اَذِلَّةٍ عَلَى الْمُؤْمِنِیْنَ اَعِزَّةٍ عَلَى الْكٰفِرِیْنَ ز یُجَاهِدُوْنَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ وَ لَا یَخَافُوْنَ لَوْمَةَ لَآىِٕمٍ ط ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ یُؤْتِیْهِ مَنْ یَّشَآءُ ط (سورۂ مائدہ ۵: آیت ۵۴)

یعنی: "عنقریب ہی خدا ایسے لوگوں کو ظاہر کر دے گا جن سے خدا محبت رکھتا ہوگا اور وہ اس سے محبت رکھتے ہوں گے۔ وہ مومنوں کے ساتھ انکساری کرنے والے (اور) کافروں کے ساتھ (پر وقار اور) سخت، خدا کی راہ میں جہاد کریں گے اور کسی ملامت کرنے والے کی ملامت کی کچھ پروا نہ کریں گے

اس آیۂ مبارکہ میں مومنین کی خدا سے جس محبت کا تذکرہ ہے اسی کا نام یقین ہے اور ایسے صاحبانِ ایمان کی مدح کرتے ہوئے سورۂ بقرہ میں ارشادِ خداوندی ہے : وَبِالْآخِرَةِ هُمْ يُوقِنُونَ (یعنی : (وہ متقین اور صاحبانِ ایمان) آخرت پر یقین رکھتے ہیں)

ایمان اور یقین کو "احسان" سے بھی تعبیر کیا گیا ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا : اَلْاِحْسَانُ اَنْ تَعْبُدَ اللّٰهَ كَاَنَّكَ تَرَاهُ (اصول کافی)

"احسان" ہی سے نکلا ہوا ایک لفظ سورۂ مائدہ کی آیت ۹۳ میں بھی استعمال ہوا ہے اور اس آیت میں ایمان کے تینوں درجات کا تذکرہ بھی ہوا ہے۔ آیت ملاحظہ فرمایئے۔ ارشاد ہوتا ہے :

لَيْسَ عَلَى الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ جُنَاحٌ فِيْمَا طَعِمُوْٓا اِذَا مَا اتَّقَوْا وَّاٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ ثُمَّ اتَّقَوْا وَّاٰمَنُوْا ثُمَّ اتَّقَوْا وَّاَحْسَنُوْا ؕ وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ

یعنی : "جن لوگوں نے ایمان قبول کیا اور اچھے اچھے کام کئے اُن پر جو کچھ کھا (پی) چکے اس میں کچھ گناہ نہیں، جب انہوں نے پرہیزگاری کی اور ایمان لے آئے پھر پرہیزگاری کی اور نیکیاں کیں (یعنی منزلِ یقین پر فائز ہوئے) اور خدا نیکی کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے"

ایمان کی طرح کفر کے بھی تین درجے ہیں۔ جیسا کہ سورۂ نساء کی آیت ۱۳۷ میں ارشادِ خداوندی ہے :

اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا ثُمَّ کَفَرُوْا ثُمَّ اٰمَنُوْا ثُمَّ کَفَرُوْا ثُمَّ ازْدَادُوْا کُفْرًا لَّمْ یَکُنِ اللّٰہُ لِیَغْفِرَ لَہُمْ وَ لَا لِیَھْدِیَہُمْ سَبِیْلًا

یعنی: "بیشک جو لوگ ایمان لائے اس کے بعد پھر کافر ہو گئے پھر ایمان لائے اس کے بعد کافر ہو گئے اور پھر کفر میں بڑھتے چلے گئے تو نہ خدا اُنکی مغفرت کرے گا اور نہ انھیں راہِ راست کی ہدایت ہی کرے گا۔"

یقین کے آثار

خداوند متعال ہر چیز سے آگاہ ہے۔ ساری کائنات اسی کی مخلوق ہے۔ وہ اپنی مخلوق کو خوب جانتا ہے۔ یہاں تک کہ انسان کے دلوں میں پوشیدہ راز سے بھی واقف ہے۔ سورۂ طٰہٰ کی چھٹی آیت میں ارشاد ہے۔ "یَعْلَمُ السِّرَّ وَاَخْفٰی" "وہ بھید اور اس سے زیادہ پوشیدہ چیز کو جانتا ہے۔"

آپ جہاں کہیں بھی چلے جائیں اور جو کچھ بھی کریں سب کچھ خدا کے علم میں ہے۔ مسلمان وہ ہے جو اس بات پر اعتقاد رکھتا ہو کہ اللہ تعالیٰ انسان کے ایک ایک عمل سے واقف ہے۔ اس کی ہلکی سی آواز سے بھی آگاہ ہے بلکہ دلوں میں چھپے ہوئے راز بھی اس کے نزدیک واضح اور روشن ہیں۔

اگر انسان اس بات پر مکمل طور پر یقین رکھے کہ خدا ہر چیز سے آگاہ ہے تو اس کے تمام اُمور کی اصلاح ہو جائے گی۔ تفسیر نیشاپوری میں یہ واقعہ لکھا ہے: "کچھ مسلمانوں کے ساتھ ایک حبشی غلام حضور کریمؐ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اور

کلمۂ شہادتین زبان پر جاری کیا اور مسلمان ہو گیا۔ اس کے بعد اُس نے کہا:
اِنَّ السَّاعَۃَ لَارَیْبَ فِیْھَا (یعنی قیامت میں کوئی شک نہیں ہے۔) خدا رسولؐ اور قیامت پر اعتقاد رکھنے سے ہی مسلمان ہو جاتا ہے۔ پھر اُس غلام نے صحابہ کی خدمت میں بہت سے دینی مسائل سمجھ لئے اور دوسری مرتبہ پھر آنحضرتؐ کی خدمت میں آکر عجیب انداز سے سوال کیا:
"اللہ کے رسولؐ! کیا ہمارا خدا عالم ہے؟" آپؐ نے فرمایا:
یَعْلَمُ السِّرَّ وَاَخْفٰی۔ "خدا دل کے راز اور انتہائی پوشیدہ چیزوں کا بھی علم رکھتا ہے۔" اُس نے تھوڑی دیر سوچنے کے بعد پوچھا!
"یعنی جس وقت میں گناہ کرتا ہوں تو وہ میرے گناہوں کو بھی دیکھتا ہے؟"
آنحضرتؐ نے فرمایا:
"ہاں! تمہارے گناہوں کو بھی دیکھتا ہے۔"
یہ سُن کر وہ چیخ پڑا۔ "ہائے رسوائی" (دل کی پاکیزگی اِسے کہتے ہیں) اور پھر زمین پر گر کر اس دُنیا سے رخصت ہو گیا!

توحیدِ افعالی پر یقین

ہم نے پہلے بھی بیان کیا ہے کہ مومن کو اس حد تک یقین ہونا چاہیئے کہ جب وہ لَا اِلٰہَ اِلَّا اللہُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللہِ کہے تو وہ مطمئن ہو کہ اس کا خالق رازق، فریادرس، زندگی عطا کرنے والا اور زندگی لینے والا خدا ہے اور اُس سے بلند مرتبہ وہ ہے جب مومن اطمینان کی ایسی منزل پر آجاتا ہے جہاں کسی قسم کی

لغزش کا نشان تک باقی نہیں رہتا اور وہ اس بات پر مکمل یقین رکھتا ہے کہ تمام امور خُدا کے ہاتھ میں ہیں ۔ دنیا کی تمام چیزیں اسبابِ ظاہری ہیں اور مسبّبُ الاسباب خدا ہے۔ اعضاء و جوارح تو فقط کام کرنے والے ہیں، قلب کو توانائی عطا کرنے والا خدا ہے۔ اسی کا نام توحید افعالی ہے۔ سُورۂ جاثیہ کی آیت نمبر ۲۲ میں ارشاد ہوا : وَلِتُجْزٰی کُلُّ نَفْسٍ بِمَا کَسَبَتْ

یعنی: "اور (مرنے کے بعد بروز قیامت) ہر شخص کو اُس کے کئے کا بدلہ دیا جائے گا" اس آیت سے واضح ہو جاتا ہے کہ مرنے کے بعد اس کے اعمال کا پورا پورا بدلہ ملے گا اور کسی پر بھی ظلم و ستم نہیں کیا جائے گا۔

منزلِ یقین تک رسائی حاصل کرنے کے چار طریقے ہیں: اوّل ذہانت دوسرے حکمت و دانائی، تیسرے عبرت اور چوتھے گزشتہ لوگوں کے حالات سے عبرت حاصل کرنا۔ گزشتہ لوگوں کے واقعات پر غور و فکر کر کے نتیجہ اخذ کرنا چاہیے اور ان کی طرح خود عمل کرنے سے گریز کرنا چاہیئے۔ کہتے ہیں کہ مؤمن کو ایک سوراخ سے دو مرتبہ نہیں ڈسا جا سکتا۔ انسان اپنے اِرد گرد ہونے والے واقعات پر غور کر کے نتیجہ نکالے اور عبرت حاصل کرے۔ مثلاً وہ اپنے اردگرد یہ دیکھے کہ بچہ بھی موت کا شکار ہو رہا ہے اور بوڑھا بھی، صحت مند بھی اس دنیا سے اُٹھ جاتے ہیں اور بیمار بھی۔ اس طرح لوگوں کو موت کا شکار ہوتے ہوئے دیکھ کر یہ نتیجہ اخذ کرے کہ میں بھی موت کا شکار ہو کر رہوں گا۔ لہٰذا اپنے سفرِ آخرت کے لئے زادِ راہ تیار کر لینا چاہیئے۔ خلاصہ یہ کہ ایک چیز کو دیکھ کر دُوسری چیز پر حکم لگائے کہ اس کے ساتھ بھی ایسا ہی ہوگا

ولایت و امامت پر یقین

آج ماہِ رمضان کی ۱۵ تاریخ ہے۔ روایاتِ صحیحہ کے مطابق یہ تاریخ دوسرے امام حضرت امام حسن مجتبیٰ علیہ السّلام کی ولادتِ باسعادت کی تاریخ ہے۔ بمقام مدینہ منورہ سن ۳ یا ۴ ہجری میں آپ کی ولادت ہوئی۔ اسی مناسبت سے آج ولایت اور امامت پر یقین کے عنوان سے گفتگو مناسب رہے گی۔ ایمان کا دوسرا ستون یقین ہے۔ اس بات پر یقین کے تمام افعال ذاتِ الٰہی کے مرہونِ منت ہیں۔ اور پھر قیامت پر مکمل یقین۔

ولایت اور امامت پر یقین کرنا اور بارہ اماموں کی محبّت سے اپنے دل کو منور رکھنا ایمان کا لازمی حصّہ ہے۔ سلسلۂ امامت کی ابتدا حضرت علیؑ ابن ابی طالبؑ ہیں۔ اور اس کی انتہا حضرت حجّت ابن الحسنؑ ہیں۔ ان بارہ اماموں کی امامت پر یقین رکھنا واجب ہے۔ بعض اوقات یہ بھی دیکھنے میں آیا ہے کہ بیرونِ ملک جانے والے امامت اور ولایت کے سلسلے میں شیطانی شکوک و شبہات کا شکار ہو جاتے ہیں۔

علیؑ، اللہ کے ولی ہیں

جب آپ یہ کہتے ہیں کہ اشہدانّ علیاً ولیّ اللہ یعنی میں گواہی دیتا ہوں کہ علیؑ اللہ کے ولی ہیں تو خدانا خواستہ اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں ہوتا کہ خداوندِ عالم نے کسی کمزوری کی وجہ سے علیؑ کو اپنا ولی اور سرپرست بنالیا ہے!

بلکہ اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ حضرت علی علیہ السّلام اللہ تعالیٰ کی جانب سے مومنین کے سرپرست ہیں۔ خداوند عالم نے انہیں مومنین پر ولایت عطا فرمائی ہے اور علی علیہ السّلام تمام اولیائے خدا کے سردار ہیں۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ بعض افراد سادہ لوح قسم کے لوگوں کو یہ کہہ کر فریب دینے کی کوشش کرتے ہیں کہ خدا کا تو کوئی ولی اور سرپرست ہو ہی نہیں سکتا۔ ایسے افراد کو کم از کم یہ تو پوچھنا چاہیئے کہ علیؑ کی ولایت سے ہم کیا مطلب لیتے ہیں۔

وَضو میں پاؤں کا دُھونا

جب آدمی منزلِ یقین تک پہنچ حاصل نہیں کر پاتا ہے تو بعض اوقات ایک معمولی سے مسئلے میں پڑ کر اس کا عقیدہ اور ایمان متزلزل ہو جاتا ہے۔ جیسا کہ بعض اوقات جاہل قسم کے لوگ یہ کہنے لگتے ہیں کہ سنّیوں کا طریقہ ہم سے بہتر ہے۔ کیونکہ سنّی حضرات جب وضو کرتے ہیں تو اپنے پاؤں کو دھوتے ہیں اور شیعہ نہیں دھوتے۔ یہ لوگ گندہ پاؤں لے کر مسجد میں چلے جاتے ہیں! یہ سوچ کہ فقط وضو کے اس طریقے سے سنّی صحیح اور شیعہ غلط ہیں، کتنی بڑی جہالت ہے۔

وضو کے سلسلے میں تو شیعہ تو بس یہ کہتے ہیں کہ قرآن اور اہلبیتؑ کے فرمان کی روشنی میں سر اور پاؤں کا مسح کرنا واجب ہے۔ جیسا کہ سورۂ مائدہ کی چھٹی آیت میں ارشاد باری تعالیٰ ہے:

إِذَا قُمْتُمْ إِلَى الصَّلٰوةِ فَاغْسِلُوْا وُجُوْهَكُمْ وَاَيْدِيَكُمْ إِلَى الْمَرَافِقِ وَامْسَحُوْا بِرُءُوْسِكُمْ وَاَرْجُلَكُمْ إِلَى الْكَعْبَيْنِ ط

یعنی: "جب تم نماز کے لئے آمادہ ہو تو اپنے مُنہ اور کہنیوں تک ہاتھ دھولیا کرو اور اپنے سروں کا اور ٹخنوں تک پاؤں کا مسح کرلیا کرو۔"

آیت میں "اَرْجُلَکُمْ" امام شافعی اور امام ابوحنیفہ کے نزدیک "اُغْسِلُوْا" پر عطف ہے۔ ہم ظاہر قرآن کے تابع ہیں۔ اور اہلبیتؑ کی اتباع کرنے والے ہیں۔ وہ لوگ امام ابوحنیفہ کے تابع ہیں۔ خداوند عالم ہر ایک کو ان کے امام کے ساتھ محشور فرمائے گا۔ اس کے علاوہ یہ بھی یاد رکھنا چاہیئے کہ پاؤں کا دھونا اور صاف ستھرا رکھنا ایک الگ کام ہے اور وضو کرنا ایک علیحدہ عمل ہے۔ وضو کرنا باطنی طہارت حاصل کرنا ہے نہ کہ ظاہری صفائی اسی لئے وضو میں قُربۃً اِلی اللہ کی نیت ضروری ہے۔ اگر کوئی شخص محض اس ارادے سے وضو یا غسل کرلے کہ اس کا جسم خوب صاف ستھرا ہو جائے اور اس کا مقصد روحانی اور معنوی پاکیزگی حاصل کرنا نہ ہو تو اس کا وضو اور غسل باطل ہے۔ چہرے مُنہ اور ہاتھ پاؤں پر صابن رگڑ رگڑ کر خوب صاف ستھرا کرنے کا نام وضو نہیں ہے۔ بلکہ اعضاء وضو کے پاک ہو جانے کے بعد قصدِ قربت کے ساتھ معنوی پاکیزگی حاصل کرنے کا نام وضو ہے۔ ممکن ہے کسی کا چہرہ یا ہاتھ نجس ہو لیکن وضو کے لئے پانی پہنچانے کے ساتھ ساتھ اعضاء بھی پاک ہو جائے اور وضو بھی صحیح ہو جائے۔

جہاں تک صفائی کا تعلق ہے تو یہ نصف ایمان ہے۔ ہر مسلمان

کے لئے ضروری ہے کہ وہ صفائی کا خیال رکھے۔ عطر لگا کر مسجد جائے لیکن یہ صفائی وضو سے مربوط نہیں ہے۔ آپ کہتے ہیں کہ اہلِ سنّت کا وضو میں پاؤں دھونا بہتر ہے۔ لیکن یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ پاؤں دھونا، پاؤں پر مسح کرنے سے ایک جداگانہ عمل ہے۔ پاؤں کا دھونا تو ہمیشہ اچھا اور پسندیدہ عمل قرار پائے گا۔ رات دن میں متعدد مرتبہ آپ اپنا پاؤں دھوئیں تاکہ اُس میں کسی قسم کی بو وغیرہ پیدا نہ ہو اور کسی کو اس سے زحمت اور تکلیف نہ پہنچے۔ لیکن پاؤں دھونے کا مطلب معنوی طہارت حاصل کرنا نہیں ہے۔

دُعائے حزیں

جب انسان یقین کی منزل سے دُور ہوتا ہے تو ایک معمولی سے جزوی مسئلے کی وجہ سے اس کا ایمان متزلزل ہو جاتا ہے۔ خدا نہ کرے کہ دنیا کی محبت اس طرح دل میں بیٹھ جائے کہ انسان اپنے دین پر ثابت قدم نہ رہ سکے۔ حضرت امام علی رضا علیہ السّلام فرماتے ہیں کہ آخری زمانے میں لوگوں کی یہ حالت ہوگی کہ صبح تو وہ مؤمن اور دیندار ہوں گے لیکن عصر کے وقت وہ بے دین ہو جائیں گے۔ راوی نے پوچھا کہ فرزند رسولؐ اگر اس زمانے میں ہم رہے تو ہمیں کیا کرنا چاہیئے؟ امام علی رضاؑ نے فرمایا کہ تمہارے اوپر لازم ہے کہ "دعائے حزین" پڑھو۔

یا اللہ یا رحمٰن یا رحیم یا مقلب القلوب ثبت قلبی علیٰ دینک۔

آج دوسرے امامؑ کی تاریخ ولادت ہے ہمیں یقین رکھنا چاہیئے کہ امام حسنؑ کی اطاعت واجب ہے اور آپ حضرت محمد مصطفےٰؐ کے دوسرے جانشین ہیں۔ صرف امام حسینؑ ہی اپنے پکارنے والے کی فریادرسی نہیں کرتے بلکہ بارہ کے بارہ آئمہ چراغ ہدایت ہیں۔ اور لوگوں کی صراطِ مستقیم کی جانب رہنمائی کرنے والے ہیں۔ جو شخص بھی ان کی ہدایت پر عمل پیرا ہوگا وہ ہدایت پائے گا اور جو شخص بھی اُن کے دامن سے دوری اختیار کرے گا وہ حقیقی اسلام کے راستے سے بھٹک جائے گا۔

منزلِ یقین اور محنت و مشقت

منزلِ یقین اور ایمان کے اعلیٰ درجہ تک رسائی حاصل کرنے کے لئے سخت محنت کرنا پڑتی ہے۔ جو لوگ دنیا کی حکومت اور ریاست کے خواہاں ہوتے ہیں وہ کس قدر محنت کرتے ہیں اور کتنی مشقت اُٹھاتے ہیں۔ کرسیٔ اقتدار کی خاطر اپنا سب کچھ داؤ پر لگا دیتے ہیں۔ اب اگر کوئی شخص جوارِ آلِ محمدؐ کے سائے میں جگہ حاصل کرنا چاہتا ہے اور ان کے ساتھ رہنا چاہتا ہے تو اُسے اس منزل تک پہنچنے کے لئے لازمی طور پر زحمت برداشت کرنی پڑے گی۔ دُعائے "ندبہ" کے الفاظ ہیں: وَشیعتک علی منابر من نور مبیضۃ وجوھھم حولی فی الجنۃ وھم جیرانی

اس دُعا میں شیعانِ محمدؐ و آلِ محمدؐ کو جنّت میں ان کا پڑوسی قرار دیا گیا ہے۔ یہ پڑوس اور اہلبیتؑ سے رفاقت بغیر زحمت اور کوشش کے حاصل نہیں

ہو سکتی۔ کیا یہ ممکن ہے کہ آدمی ہر قسم کی پابندی سے آزاد رہ کر اور اپنی مرضی کے مطابق زندگی گزارتا رہے اور پھر وہ جنّت میں محمدؐ و آل محمدؐ کے قریب جگہ پالے۔ شیعانِ علیؑ نے یقین اور ایمان کے بلند درجات یونہی حاصل نہیں کر لئے تھے۔ سلمانؓ، ابوذرؓ جیسا مقام حاصل کرنے کے لئے بڑا طولانی فاصلہ طے کرنا ہوگا۔ اور خاصی زحمتیں برداشت کرنا پڑے گی۔

ہمیشہ عبرت حاصل کرو

منزل یقین حاصل کرنے کے لئے صرف ایک دو روز نہیں بلکہ مسلسل محنت کرنے کی ضرورت ہے جب آپ اپنے گھر سے نکلیں اور واپس لوٹیں تو جو کچھ بھی دیکھیں اس سے عبرت حاصل کریں۔ مثلاً آپ گزر رہے ہیں اسی وقت آپ کی نظر میک اپ کی ہوئی عورت پر پڑتی ہے تو آپ یہ سوچیں کہ جب یہ بدبخت عورت مر کر کفن میں لپٹی ہوگی تو اس کی کیا حالت ہوگی۔ ذرا سوچو جب اس کا یہ فیشن زدہ لباس اُتار کر کفن پہنا دیا جائے گا اور اس کی میک اپ زدہ صورت کو یکسر بدل کر قبر کی مٹی پر رکھ دیا جائے گا تو اس کا کیا عالم ہوگا؟ آج جو یہ اپنی آنکھوں سے خیانت کرتی پھر رہی ہے ان آنکھوں کا قبر میں کیا انجام ہوگا قبر میں سب سے پہلے کیڑے جس حصّے کو کھاتے ہیں وہ یہی آنکھیں ہیں۔ مختصر یہ کہ آدمی کبھی بھی نصیحت اور عبرت حاصل کرنے کا کوئی موقع ہاتھ سے نہ جانے دے

اطاعت میں نجات

حضرت علی علیہ السّلام فرماتے ہیں:

مَنْ نَجَا اِنَّمَا نَجَا بِطَاعَةِ اللّٰہِ وَمَنْ ھَلَکَ اِنَّمَا ھَلَکَ بِمَعْصِیَۃِ اللّٰہِ

(اُصولِ کافی)

یعنی: "جس شخص نے بھی نجات حاصل کی تو اس نے اللہ کی اطاعت کے ذریعے نجات حاصل کی اور جو شخص بھی ہلاک ہوا۔ وہ خدا کی نافرمانی کی وجہ سے ہلاک ہوا۔"

اے یقین کے چاہنے والو! تو ذرا گزشتہ لوگوں کے حالات پر غور و خوض کرو اور اس سے عبرت حاصل کرو۔ زمین پر آنے والے سب سے پہلے انسان حضرت آدم ابوالبشرؑ اور اُن کے بیٹوں کے واقعے پر غور کرو۔ جس بیٹے کو نجات حاصل ہوئی وہ خدا کی اطاعت کرنے والا تھا اور جو بیٹا ہلاک ہُوا وہ خدا کی نافرمانی کرنے والا تھا۔ اس واقعہ کا تذکرہ سورۂ مائدہ کی ستائیسویں آیت میں یوں ہوا ہے:- وَاتْلُ عَلَيْهِمْ نَبَاَ ابْنَيْ اٰدَمَ بِالْحَقِّ ۘ اِذْ قَرَّبَا قُرْبَانًا فَتُقُبِّلَ مِنْ اَحَدِهِمَا وَلَمْ يُتَقَبَّلْ مِنَ الْاٰخَرِ ۭ قَالَ لَاَقْتُلَنَّكَ ۭ قَالَ اِنَّمَا يَتَقَبَّلُ اللّٰهُ مِنَ الْمُتَّقِيْنَ

یعنی: (اے رسولؐ) تم اُن لوگوں سے آدمؑ کے دو بیٹوں (ہابیل اور قابیل) کا سچا قصہ بیان کردو کہ جب ان دونوں نے خدا کی درگاہ میں قربانیاں پیش کیں تو ان میں سے ایک (ہابیل) کی (قربانی) قبول ہوئی اور دُوسرے (قابیل) کی (قربانی) قبول نہیں ہوئی تو (مارے حسد کے ہابیل سے) کہنے لگا کہ میں تجھے مار ڈالوں گا۔ اس نے جواب دیا کہ (بھائی) اس میں میں کیا کرسکتا ہوں؟ خدا تو صرف پرہیزگاروں کی نذر قبول کرتا ہے۔

ہابیل کی قربانی اسی لئے قبول ہو گئی کہ وہ خدا کی خوشنودی چاہتے تھے ان کا مقصد اطاعت خدا تھا اسی لئے وہ اپنے والد کے جانشین قرار پائے جب کہ ان کے بھائی قابیل خدا کی اطاعت سے دُور ہو گئے تھے۔ انہوں نے نافرمانی اور معصیت کا راستہ اختیار کر لیا تھا اسی لئے وہ ہلاک ہو گئے۔ قابیل کے دل میں اپنے بھائی سے حسد پیدا ہوا، اور پھر حسد کا یہ شعلہ اتنا بھڑکا کہ ایک پتھر اُٹھا کر اپنے بھائی کو قتل کر دیا۔ اور ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اپنی تباہی اور بربادی کا سامان کر لیا۔

بھائیو! اور بہنو تم کبھی حسد میں مبتلا نہ ہونا۔ غیر تو کیا کبھی اپنے ہی بھائیوں اور بہنوں سے حسد نہ کرنا۔ اے دفتروں اور کارخانوں میں کام کرنے والو! کبھی اپنے ساتھ کام کرنے والوں سے حسد نہ کرنا کہ فلاں ساتھی کیوں ترقی کر گیا؟ اُسے اتنا زیادہ مالی فائدہ کیوں حاصل ہو گیا؟ وہ اتنا دولت مند کیسے بن گیا؟

یہ سب سوالات سوچ سوچ کر جلنے اور حسد کرنے کے بجائے، حسد کے آخری انجام کو کے بارے میں سوچو کہ اس کا انجام کیا ہو گا؟ حسد کر کے آدمی کتنے بڑے گناہ کا مرتکب ہوتا ہے اگر شروع ہی میں آدمی حسد کے آخری، انجام کے بارے میں سوچ لے تو کبھی اس بلا میں مبتلا نہ ہو۔

فصل - ۴

ایمان کی قوّت

سورۂ مبارکۂ نحل کی آیت ۹۷ میں ارشاد ہوا: مَنْ عَمِلَ صَالِحًا مِّنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَلَنُحْيِيَنَّهٗ حَيٰوةً طَيِّبَةً ۚ وَلَنَجْزِيَنَّهُمْ اَجْرَهُمْ بِاَحْسَنِ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ

یعنی: "مرد ہو یا عورت جو شخص نیک کام کرے گا اور وہ ایمان دار بھی ہو تو ہم اسے (دنیا میں بھی) پاک و پاکیزہ زندگی بسر کرائیں گے (اور آخرت میں بھی)، جو کچھ وہ کرتے تھے اس کا اچھے سے اچھا اجر و ثواب عطا فرمائینگے۔"

اس آیۂ مبارکہ میں اعلانِ پروردگار ہو رہا ہے کہ ہم بلا تفریق مرد و زن، اگر وہ صاحبِ ایمان ہوگا تو ہم اسے بہترین زندگی سے نوازینگے۔ درحقیقت تربیت دینے والا اور پرورش کرنے والا خدا ہے۔

پرورش کرنے والا خدا ہے

ہماری گفتگو توحید کے عنوان سے جاری ہے۔ آج اس موضوع پر ذرا اور تفصیل سے روشنی ڈالی جائے گی۔ دراصل اپنے بندے کی تربیت اور پرورش کرنے والا خدا ہے۔ الوہیت اور ربوبیت کے کئی مراتب ہیں۔ لفظ "اللہ" اپنے اندر خدا کی تمام صفاتِ کمالیہ لئے ہوئے ہے۔ خدا ہمارا رب ہے کا مطلب یہ ہوا کہ ہمارا وجود، ہماری بقا اور ہماری پرورش سب کچھ اسی کی طرف سے ہے۔ کل میں نے عرض کیا تھا کہ ہماری جان اسی کے قبضۂ قدرت میں ہے ہماری غذا کی خواہش اور بھوک اور اسے مٹانے والا وہی ہے۔ ہمارے پورے جسم پر اسی کی حاکمیت ہے۔ ہمارا لباس، ہمارا مال، ہمارے بیوی بچے سب اسی کی عنایات کے مرہونِ منت ہیں۔ اللہ پر ایمان کا مطلب اس کی نعمتوں کا اقرار ہے۔ تمام نعمتیں اسی کی جانب سے ہیں۔ سورۂ نحل کی آیت ۵۳ میں ارشاد ہوا:

وَمَا بِكُم مِّن نِّعْمَةٍ فَمِنَ اللَّهِ ثُمَّ إِذَا مَسَّكُمُ الضُّرُّ فَإِلَيْهِ تَجْأَرُونَ

یعنی: "جتنی نعمتیں تمہارے ساتھ ہیں (سب) خدا ہی کی طرف سے ہیں۔ پھر جب تم کو تکلیف چھو بھی گئی تو تم اسی کے آگے فریاد کرنے لگتے ہو پھر جب تم سے تکلیف کو دُور کر دیتا ہے تو بس فوراً تم میں سے کچھ لوگ اپنے پروردگار کا شریک ٹھہراتے ہیں۔"

اللہ تبارک وتعالیٰ نے ہمیں ہر قسم کی نعمتوں سے نوازا ہے۔ ہر عقل رکھنے والا جب اپنے وجود پر غور و فکر کرے تو وہ بآسانی اپنے خالقِ حقیقی کی

معرفت حاصل کرسکتا ہے۔ ذرا سوچئے کہ ایک وقت وہ تھا جب وہ اس دنیا میں نہیں تھا۔ پھر وہ وجود میں آگیا۔ کیا وہ خود بخود اس دنیا میں آگیا؟ اور کیا اس کا وجود مستقل حیثیت رکھتا ہے؟ اور پھر اپنے ہی جیسے دوسرے انسانوں کی زندگی پر نظر ڈالئے ایک عرصے کے بعد وہ موت کا شکار ہوتے ہوئے دکھائی دینگے معلوم ہوا کہ ان کا وجود مستقل حیثیت کا حامل نہیں ہے بلکہ وہ ممکن الوجود ہے کسی زبردست قدرت وعلم رکھنے والی ہستی نے اُسے پیدا کیا ہے۔ آدمی اپنے جسم میں موجود نظام کے بارے میں سوچے۔ روٹی کا ایک لقمہ جب منہ میں جاتا ہے تو کس طرح سے غذا کی نالی سے ہوتا ہُوا، معدہ اور آنتوں میں پہنچتا ہے۔ پھر یہ غذا کس طرح سے جسم کے تمام حصّوں کو توانائی فراہم کرتی ہے اور بے کار حصّے فضلے کی صورت میں خارج ہوجاتے ہیں۔ جسم میں پہنچنے والی یہ غذا حیرت انگیز طور پر جسم کے سب ہی حصّوں مثلاً جگر اور دل کو خون فراہم کرتی ہے اور یہ خون ۳۶۰ رگوں کو متحرک کردیتا ہے۔ اس طرح بدن کے ایک ایک جزُ تک توانائی پہنچتی ہے۔ مختصر یہ کہ جسم کے اس حیرت انگیز اور پیچیدہ نظام ہاضمہ پر غور کرکے ہر صاحبِ عقل یہ بخوبی سمجھ سکتا ہے کہ اس کا کوئی عظیم خالق ہے اور یہ جسم اسی کا عطا کیا ہُوا ہے، اسی نے اس وجود کو باقی رکھا ہے اور ہر وقت اور ہر جگہ اپنے بندے کے ساتھ ہے۔

خُدا ہر جگہ موجُود ہے

توحید پر عقیدہ رکھنے کا مطلب یہ ہے کہ بندہ اس بات پر بھی یقین

رکھتا ہو کہ خدا ہر جگہ موجود ہے اور ہر وقت اس کے ساتھ ہے۔ اسی لئے ہم کہتے ہیں کہ آپ باقاعدگی سے قرآن مجید کی تلاوت کیا کریں۔ تلاوتِ قرآن مجید ایک مسلّم حکم ہے۔ شب و روز میں اپنی استطاعت کے مطابق تلاوت کرنا چاہیئے سورۂ مزمل کی آیت ۲۰ میں ارشادِ ربّ العزت ہے:

فَاقْرَءُوْا مَا تَيَسَّرَ مِنَ الْقُرْآنِ

یعنی! "پس جتنا آسانی سے ہو سکے اتنا قرآن پڑھ لیا کرو۔"

قرآن مجید کی تلاوت کا حکم اس لئے دیا گیا ہے کہ اس سے ایمان مستحکم ہو جاتا ہے۔ عقیدہ توحید پر یقین بڑھتا چلا جاتا ہے۔ جب انسان سورۂ حدید کی چوتھی آیت کی تلاوت کرتے ہوئے زبان سے یہ ادا کرے گا: وَهُوَ مَعَكُمْ اَيْنَمَا كُنْتُمْ (یعنی: "تم جہاں کہیں بھی رہو وہ خدا تمہارے ساتھ ہے) تو ظاہر ہے کہ توحید پر اس کا ایمان پختہ ہو جائے گا اور وہ خداوند متعال کو اس کی تمام صفات کے ساتھ دل کی گہرائی سے ماننے والا ہو جائے گا۔

اسی طرح سورۂ مبارکۂ مجادلہ کی آیت ۷ میں ارشاد ہوا: مَا يَكُوْنُ مِنْ نَّجْوٰى ثَلٰثَةٍ اِلَّا هُوَ رَابِعُهُمْ وَلَا خَمْسَةٍ اِلَّا هُوَ سَادِسُهُمْ وَلَآ اَدْنٰى مِنْ ذٰلِكَ وَلَآ اَكْثَرَ اِلَّا هُوَ مَعَهُمْ اَيْنَ مَا كَانُوْا

یعنی: "جب تین (آدمیوں) کا خفیہ مشورہ ہوتا ہے تو وہ (خدا) اُن کا ضرور چوتھا ہوتا ہے اور جب پانچ آدمی مشورہ کرتے ہیں تو وہ اُن کا چھٹا ہوتا ہے اور اس سے کم ہوں یا زیادہ اور چاہے جہاں کہیں ہوں وہ اُن کے ساتھ ضرور ہوتا ہے۔"

معلوم ہوا کہ توحید کا مطلب صرف یہی نہیں کہ خدا کو ایک مانا جائے بلکہ اس بات پر یقین ہونا چاہیئے کہ خدا ہر وقت اور ہر جگہ ہمارے ساتھ ہے وہ ہمارے ایک ایک عمل سے واقف ہے وہ قیوم ہے وہ قیّم ہے وہ ربّ ہے۔ وہ رزّاق ہے وہ ہماری تربیّت کرنے والا ہے اگر ہم نے صحیح معرفت حاصل کی اور اس کا سچا خوف رکھا تو ہمیں اس کے بدلے جنّت کے دو باغ عطا فرمائے گا۔ سُورۂ رحمان کی آیت ۴۶ میں وہ خود اس کا اعلان فرماتا ہے:

وَلِمَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ جَنَّتَانِ ط

یعنی: "اور جو شخص اپنے پروردگار سے ڈرتا رہے اس کے لئے دو باغ ہیں۔"

ہاں! خوفِ خدا رکھنے والے مومن کو جنّت میں دو باغ عطا کئے جائینگے ایک صحیح عقیدہ اور معرفت پروردگار رکھنے پر اور دوسرے اُس عقیدے کے مطابق نیک عمل بجالانے پر۔

لِنُحْيِيَنَّهٗ حَيٰوةً طَيِّبَةً (یعنی: ہم اسے پاک و پاکیزہ زندگی بسر کرائیں گے) اس پاک و پاکیزہ زندگی عطا کرنے کا تذکرہ قرآن کریم میں متعدد مقامات پر ہوا ہے۔ یہ حیوۃ طیّبہ اُسی وقت حاصل ہو سکتی ہے جب آدمی خود کو اپنے معبودِ حقیقی کے سپرد کردے۔ اسی کا نام ایمان اور یقین ہے۔ سُورۂ لقمان کی آیت ۲۲ میں ارشاد باری تعالیٰ ہو رہا ہے:

وَمَنْ يُّسْلِمْ وَجْهَهٗٓ اِلَى اللّٰهِ وَهُوَ مُحْسِنٌ فَقَدِ اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقٰى ط وَاِلَى اللّٰهِ عَاقِبَةُ الْاُمُوْرِ

یعنی: "جو شخص خُدا کے آگے اپنا سَر (تسلیم) خم کر دے اور وہ نیکوکار ہو تو بیشک اُس نے (ایمان کی) مضبوط رسّی پکڑلی اور (آخر تو) سب کاموں کا انجام خدا ہی کی طرف ہے۔"

جب انسان حیٰوۃ طیّبہ کا خواہاں ہوتا ہے اور ایمان کی مضبُوط رسّی کو تھام کر خود کو خداوند متعال کے سپرد کر دیتا ہے تو اس پر معمولی سی بھی خواہشاتِ نفسانی کا غلبہ نہیں ہونے پاتا۔ اس کی نظر میں مال و دولت اور حکومت و ریاست کوئی اہمیت نہیں رکھتے۔ وہ اچھی طرح سمجھ لیتا ہے کہ عزّت و وقار کا تعلّق ایمان سے ہے۔ جیسا کہ سورۂ منافقون میں آیا ہے: وَ لِلّٰہِ الْعِزَّۃُ وَ لِرَسُوْلِہٖ وَ لِلْمُؤْمِنِیْنَ (یعنی: عزّت تو بس اللہ، اس کے رسُولؐ اور مُومنین کے لئے ہے) ایمان کی عظمت کو سمجھنے کے بعد بندہ مومن کبھی بھی اسلامی احکامات سے، روگردانی نہیں کرتا۔ اس کے شب و رُوز الٰہی احکامات کے تابع ہوتے ہیں اور وہ باقاعدگی سے قرآنِ مجید کی تلاوت کرتا ہے تاکہ اس کا ایمان مزید مستحکم ہوتا چلا جائے۔

ایمان بُرائی سے روکتا ہے

ایمان برائی سے روکتا ہے۔ اس سلسلے میں آپ کے سامنے ایک مثال پیش کرتا ہوں۔ اوائل اسلام میں فضالہ ابن عمیر نامی ایک شخص تھا۔ وہ تھا تو کافی عقل مند لیکن اس کا دل گناہوں کی آلودگیوں سے پُر تھا۔ چُنانچہ شروع

شروع وہ بظاہر اسلام لانے کے بعد بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے دل میں سخت دشمنی رکھتا تھا۔ یہاں تک کہ اُس نے اپنے دل میں ٹھان رکھا تھا کہ موقع ملتے ہی اچانک آنحضرتؐ پر حملہ کر کے قتل کر دے گا۔ ایک مرتبہ مسجدِ حرام میں اُس کا سامنا رسولِ خدا سے ہو گیا۔ آپؐ نے اس سے فرمایا "تم ہو فضالہ؟" اُس نے کہا "ہاں"! آپؐ نے فرمایا: "کیا ارادہ رکھتے ہو؟" یہ کہہ کر آنحضرتؐ اُسے یہ سمجھانا چاہتے تھے کہ میں تیرے بُرے ارادے سے واقف ہوں۔ مجھے معلوم ہے کہ تو مجھے قتل کرنا چاہتا ہے۔ اُس نے بات کو گھما کر کہا "میں طواف کرنے آیا ہوں"۔ نبی کریمؐ نے مُسکراتے ہوئے فرمایا: "توبہ کر! تو کیسے شیطانی خیالات میں مبتلا ہے! قتل کرنا وحشی لوگوں کا کام ہے!" اتنا کہنا تھا کہ وہ تھر تھر کانپنے لگا۔ آنحضرتؐ نے اپنا دستِ مبارک اس کے سینے پر رکھ دیا چنانچہ اس کا اضطراب ختم ہو گیا اور اُس نے اب دل کی گہرائی سے کہا:

لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَاَنَّ مُحَمَّدًا رَسُوْلُ اللّٰہِؐ

ایمانِ حقیقی اسے کہتے ہیں۔ نہ یہ کہ آدمی اپنے مومن ہونے کا دعویٰ بھی کرتا رہے اور دوسرے مُسلمان بھائی کو قتل بھی کرتا رہے! جب آدمی کہتا ہے "لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ" تو گویا یہ اعلان کرتا ہے کہ اب میں بے لگام نہیں ہوں اور جب کہتا ہے: "اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ"۔ تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اگر میں کوئی گناہ کا ارتکاب کرتا ہوں تو مجھے اپنے خُدا کے حضور شرم سار ہونا پڑے گا۔ کیا آپ یہ سمجھتے ہیں کہ "لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ

کہنے سے بس سب کچھ درست ہوگیا؟ یاد رکھیئے یہ کلمہ اپنے اندر بڑے وسیع معنی رکھتا ہے۔ بہت سے ایسے مسلمان ہیں جنہوں نے ابھی تک اللہ تعالیٰ کی بندگی کے تقاضے کو نہیں سمجھا ہے۔ وہ خداوند متعال کے حضور جوابدہ ہونے کے دل سے قائل نہیں ہیں۔

ہاں تو میں یہ بیان کر رہا تھا کہ فضالہ دل کی گہرائیوں سے ایمان لے آیا۔ اب ایک مرتبہ وہ مکہ کی ایک گلی سے گزر رہا تھا۔ اس کی ایک پرانی فاحشہ دوست سرراہ مل گئی وہ پہلے اس کی محبوبہ ہوا کرتی تھی۔ فضالہ کی نظر اس پر پڑی تو فوراً آنکھیں جھکالیں اور منہ پھیر لیا۔ عورت نے اسے پکار کر کہا: "فضالہ! تمہیں کیا ہوگیا ہے۔ آخر کون سی مصیبت تم پر پڑ گئی ہے۔ کیا تم میرے پرانے دوست نہیں ہو؟" فضالہ نے جواب دیا: "یہ صحیح ہے کہ پہلے میری تم سے دوستی تھی مگر اب نہیں ہے۔ اب میں نے ایسا راستہ اختیار کرلیا ہے کہ تجھ سے نہیں مل سکتا۔" عورت نے پوچھا: "تم نے کون سا راستہ اختیار کیا ہے؟ اس نے جواباً کہا:

"میں اب محمد مصطفیٰ کی سچی اتباع کرنے والا بن گیا ہوں۔ جو شخص بھی محمد کا سچا پیروکار ہو جائے تو وہ فسق و فجور سے کوئی تعلق نہیں رکھ سکتا۔ (ماخوذ از "دنیا در خطرِ سقوط" تحریر ابوالاعلیٰ مودودی) سچ ہے جب بندہ دل کی گہرائی سے ایمان لے آتا ہے تو وہ اس بات پر کامل یقین رکھنے والا ہوجاتا ہے کہ وھو القاھر فوق عبادہ (سورۃ انعام: آیت ۱۸) یعنی: "وہی اپنے تمام بندوں پر غالب ہے۔"

مہاجرین اور نجاشی بادشاہ

اوائل اسلام میں مشرقین مسلمانوں کو طرح طرح سے اذیتیں پہنچایا کرتے تھے۔ آخر مجبوراً انہوں نے حبشہ کی طرف ہجرت کی۔ وہاں کے نجاشی بادشاہ نے ان کے ساتھ اچھا سلوک کیا۔ یہ دیکھ کر مکہ کے مشرکوں نے اپنے دو نمائندے عمرو عاص اور عمارہ کو نجاشی کے پاس روانہ کیا۔ اُن دونوں کو وہاں بھیجنے کا مقصد یہ تھا کہ کسی طرح ہجرت کرنے والے مسلمانو کو یا تو اپنی تحویل میں لے کر قتل کر دیا جائے یا پھر وہیں بادشاہ سے کہہ کر انہیں قتل کروا دیا جائے۔

نجاشی بادشاہ کے دربار کا باقاعدہ تھا کہ وہاں آنے والا پہلے بادشاہ سلامت کو سجدہ کیا کرتا تھا چنانچہ عمرو عاص اور عمارہ نے بھی بادشاہ کو سجدہ کیا اور اس کے دائیں بائیں بیٹھ گئے۔ مہاجرین حبشہ میں حضرت علی علیہ السلام کے بھائی جعفر ابن ابی طالب بھی شامل تھے۔ جب وہ مسلمانوں کا وفد لے کر دربار میں تشریف لائے تو انہوں نے صرف اتنا کہا: اَلسَّلَامُ عَلٰی مَنِ اتَّبَعَ الْھُدٰی (یعنی: اس شخص پر سلامتی ہو جو ہدایت کی پیروی کرے۔) حضرت جعفرؑ یہ جملہ کہنے کے بعد دربار کے ایک گوشے میں خالی جگہ پر جا کر تشریف فرما ہوئے بادشاہ کے سامنے سجدہ تو درکنار انہوں نے اپنے سر کو ذرا سا خم بھی نہیں کیا۔ ایسے موقع پر بدبخت عمرو عاص نے کہا: جناب نجاشی! میں نے پہلے ہی کہا تھا کہ یہ مسلمان آپ کے حق میں بُرے ہیں۔ دیکھا، انہوں نے آپ کو سجدہ نہیں کیا۔ اب یا تو ان کو قتل کر دیں یا ہماری تحویل میں دے دیں تاکہ ہم انہیں

قتل کر ڈالیں۔

نجاشی نے کہا: "ان مسلمانوں سے پوچھو! انہوں نے شاہی آداب کا خیال کیوں نہیں کیا؟" جناب جعفرؓ سے سوال کیا گیا: "تم شاہی آداب کیوں نہیں بجالائے؟ انہوں نے جواب دیا: "ہم مسلمان ہیں۔ مسلمان کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ خدا کے علاوہ کسی اور کو سجدہ کرے۔ بادشاہ کی اس اعتبار سے معمولی سی بھی حیثیت نہیں کہ ہم اُسے سجدہ کریں۔ بادشاہ بھی ہماری طرح ایک عاجز انسان ہے۔ ہم دونوں ہی خاک سے پیدا ہوئے۔ دونوں کو اُسی خالقِ حقیقی کے احکام بجالانے چاہئیں اور آخر کار دونوں کو اس عادل خدا کی بارگاہ میں پیش ہونا ہے۔ مسلمانوں پر حرام ہے کہ وہ خدا کے مقابلے میں کسی اور کو سجدہ کریں۔ جو کوئی بھی خدا کے شایانِ شان بندگی کا حق ادا کرتا ہے۔ خدا بھی اس پر اپنا لطف و کرم فرماتا ہے۔

دربار میں جناب جعفرؓ کی یہ باتیں سُن کر نجاشی متاثر ہوا۔ اور کہا: جس دین کی یہ باتیں کرتے ہیں وہ سچا دین ہے۔ کچھ عرصے بعد بادشاہ نے اسلام قبول کرنے کا بھی اظہار کر دیا! مشرکینِ مکہ کے ان دونوں نمائندوں نے بہت کوشش کی کہ کسی طرح مسلمان مہاجرین کو اپنے ہمراہ لے جائیں لیکن بادشاہ نے ایسا کرنے کی اجازت نہیں دی۔ بلکہ ان مسلمانوں کی حفاظت کے ساتھ ساتھ ان کے قیام اور دیگر ضروریات زندگی کو پورا کرنے کا بندوبست بھی کر دیا۔ سورۂ نحل کی آیت ۹۹ میں یہی تو کہا گیا ہے کہ "مرد ہو یا عورت جو شخص نیک کام کرے گا اور ایمان دار بھی ہو تو ہم اسے (دنیا میں بھی) پاک و

پاکیزہ زندگی بسر کرائیں گے (اور آخرت میں بھی) جو کچھ وہ کرتے تھے اس کا اچھے سے اچھا اجر و ثواب عطا فرمائیں گے"

ایمان کے ساتھ زندگی پاک و پاکیزہ زندگی ایک ایسی قوت ہے جسکی وجہ سے مومن بڑے سے بڑے مشکل وقت پر بھی نہیں گھبراتا۔ وہ تمام مصائب خوشی خوشی برداشت کرلیتا ہے۔ نہ تو وہ مشکلات و مصائب سے راہِ فرار اختیار کرتا ہے اور نہ ہی حق کا ساتھ چھوڑتا ہے۔ حیاتِ طیبہ پانے والے مومن کسی مادی چیز کا لالچ نہیں رکھتے۔ دولت، عورت، شہرت اور ریاست اُسے راہِ حق سے نہیں ہٹا سکتے۔ وہ خدا کی خاطر تمام مصائب جھیل لیتا ہے اور اور اس کی خاطر اپنی جان کی بازی لگانے کے لئے تیار ہو جاتا ہے۔

جادوگروں کا ایمان

فرعون کے جادوگروں کی تعداد ستر تھی۔ ان کا پیشہ ہی سحر و جادو تھا تھا۔ فرعون نے ان سے وعدہ کیا کہ اگر وہ حضرت موسیٰؑ پر غالب آگئے تو وہ انہیں مقام و منصب عطا کرے گا۔ پھر جب موقع آیا اور حضرت موسیٰؑ کے عصا نے ان تمام جادوگروں کے بنائے ہوئے سانپوں کو نگل لیا تو وہ سب کے سب ایمان لے آئے۔ قرآن مجید نے ان کے ایمان لانے کو یوں بیان کیا ہے:

قَالُوْٓا اٰمَنَّا بِرَبِّ هٰرُوْنَ وَ مُوْسٰى

(سورۂ طٰہٰ: آیت ۷۰)

یعنی: "وہ سب (جادوگر) کہنے لگے کہ ہم موسیٰ و ہارون کے پروردگار پر ایمان لائے۔" ظاہر ہے کہ اس واقعہ کے بعد حضرت موسیٰ علیہ السلام کی عظمت و بزرگی کھل کر سامنے آگئی اور فرعون ذلیل و خوار ہوا۔ اس نے اپنے تمام جادوگروں کو اپنے پاس بلا کر کہا: "تم لوگ میری اجازت کے بغیر موسیٰ کے خدا پر کیوں ایمان لے آئے؟" اور کہا کہ مَا عَلِمْتُ لَكُمْ مِنْ إِلٰهٍ غَيْرِي ط (سورۂ قصص ۲۰: آیت ۳۸) یعنی: "مجھ کو تو اپنے سوا کوئی تمہارا پروردگار معلوم نہیں ہوتا۔"

ایمان کی دولت سے مالا مال ہو جانے والے جادوگروں نے جواب دیا کہ ہم پر حق آشکار ہو چکا ہے۔ اب ہمیں تمہاری طرف سے عطا کئے جانیوالے مقام و منصب کا کوئی لالچ نہیں ہے۔ جب فرعون کی پیشکش بے اثر ثابت ہوئی تو وہ دھمکی پر اتر آیا۔ بالفاظ قرآنی وہ کہنے لگا: لَأُصَلِّبَنَّكُمْ فِي جُذُوعِ النَّخْلِ (سورۂ طٰہٰ ۲۰: آیت ۷۱)

یعنی: "میں تمہیں یقیناً خرموں کی شاخوں پر سولی چڑھا دوں گا۔" اس پر انہوں نے کہا: قَالُوا لَا ضَيْرَ إِنَّا إِلَىٰ رَبِّنَا مُنْقَلِبُونَ (سورۂ شعراء ۲۶: آیت ۵۰)

یعنی: "وہ بولے پرواہ نہیں ہم کو تو بہر حال اپنے پروردگار کی طرف لوٹ کر جانا ہے۔"

معلوم ہوا کہ جب انسان کے قلب میں ایمان اور یقین پیدا ہو جائے وہ نہ تو کسی لالچ کا شکار ہوتا ہے اور نہ ہی اس پر کوئی خوف طاری ہوتا ہے

بلکہ وہ تو موت سے بھی نہیں ڈرتا، راہِ خدا میں قتل ہو جانے کو وہ اپنے لئے باعثِ سعادت سمجھتا ہے۔

مُومنین کو زندہ جلا دیا گیا

سورۂ معارج میں ارشاد باری تعالیٰ ہے:۔

النَّارِ ذَاتِ الْوَقُودِ ۝ إِذْ هُمْ عَلَيْهَا قُعُودٌ ۝ وَهُمْ عَلَىٰ مَا يَفْعَلُونَ بِالْمُؤْمِنِينَ شُهُودٌ ۝ وَمَا نَقَمُوا مِنْهُمْ إِلَّا أَنْ يُؤْمِنُوا بِاللَّهِ الْعَزِيزِ الْحَمِيدِ ۝ الَّذِي لَهُ مُلْكُ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ وَاللَّهُ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ شَهِيدٌ (سورۂ بروج: آیت ۴ تا ۹)

یعنی: "خندق والے ہلاک کر دیئے گئے جو خندقیں آگ کی تھیں جس میں انہوں نے مسلمانوں کے لئے ایندھن جھونک رکھا تھا۔ جب وہ ان (خندقوں) پر بیٹھے ہوئے جو سلوک ایمانداروں کے ساتھ کرتے تھے اس کو سامنے دیکھ رہے تھے، اور ان کو مومنین کی یہی بات بری معلوم ہوئی کہ وہ لوگ خدا پر ایمان لائے تھے جو زبردست (اور) سزاوارِ حمد ہے۔ وہ (خدا) جس کی سارے آسمان و زمین میں بادشاہت ہے اور خدا ہر چیز سے واقف ہے۔"

اصحابِ اخدود کا واقعہ کچھ یوں ہے کہ حبشہ کا ایک بادشاہ خود اپنی اور بتوں کی پرستش کروایا کرتا تھا۔ اس زمانے کے نبیؑ نے اسے گناہ سے باز رکھنے کی پوری کوشش کی لیکن وہ نہ مانا۔ بلکہ اس نبیؑ اور ان کے پیروکاروں کا کھلا دشمن ہو گیا۔ وہ صاحبان ایمان کو آگ میں ڈال کر جلا دیا کرتا تھا۔

آخر ایک مرتبہ اس ظالم بادشاہ نے ظاہری غلبہ پانے کے لئے بڑی سی خندق کھدوائی اور اس میں آگ بھڑکانے کا حکم دیا۔ جب آگ خوب اچھی طرح بھڑک گئی تو اس نے تمام مومنین کو جمع کر لیا اور ایک ایک سے پوچھتا:

یہاں کا بادشاہ خدا ہے یا کائنات کا خالق خدا ہے؟ اگر جواب ملتا "کائنات کا خالق" تو وہ اسے خندق کی آگ میں پھینک دیا جاتا۔ اور اگر وہ کہتا یہاں کا بادشاہ خدا ہے تو اسے چھوڑ دیا جاتا۔

صاحبان ایمان خدائے وحدہٗ لاشریک کی قدرتِ کاملہ پر یقین رکھتے ہوئے اپنے ہی پیروں سے چل کر اُس آگ میں چلے جاتے تھے۔ میں نے ایک روایت میں دیکھا ہے کہ اس طرح بیس ہزار مسلمان اُس آگ میں ڈلوا دیئے گئے۔ اور تفسیر میں ہے کہ ایک عورت کا بہت چھوٹا سا بچہ تھا وہ ابھی دودھ پیتا تھا جب اس بے چاری عورت کو یہ اختیار دیا گیا کہ وہ بادشاہ پرست ہو کر آزاد ہو جائے یا خدا کی بندگی کرتے ہوئے آگ میں کود کر جل جائے تو اس نے پہلے تو یہ عزم کیا کہ آگ میں کود جائے گی لیکن جب اپنے بچے کا چہرہ دیکھا تو ذرا دیر کے لئے رُک گئی۔ (چند ہی ایسے بچوں کا تذکرہ ملتا ہے جنہوں نے گہوارے کی عمر میں بات کی ہو۔ ان میں حضرت عیسیٰؑ علیہ السّلام ہیں اور ایک اصحاب احدود کا یہ شیر خوار بچہ ہے) چنانچہ جب بچے نے دیکھا کہ ماں تأمل سے کام لے رہی ہے تو بول پڑا: "اماں جان! آپ آگ میں چلی جائیں اور مجھے بھی ساتھ لیتی جائیں راہِ خدا میں کسی چیز کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔ ہماری یہ جان جنّت کے مقابلے میں بہت معمولی ہے۔"

کاش! انسان کے پاس جان سے بھی بڑھ کر کوئی عزیز ترین چیز ہوتی تو وہ اُسے خدا کی راہ میں پیش کر دیتا۔ یہی وجہ ہے کہ علماء کے قول کے مطابق کچھ شہداء نے شبِ عاشور کہا تھا: "اے ہمارے مولا اور آقا حسینؑ! کاش ہمیں قتل کیا جاتا پھر زندہ کیا جاتا۔ یہاں تک کہ ستر مرتبہ ہم اپنی جان کا نذرانہ پیش کرتے لیکن افسوس کہ ایک سے زیادہ مرتبہ جان قربان نہیں کی جا سکتی۔

یقین کی حفاظت کرو

کتاب "اصول کافی" میں ہے ایک مرتبہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم صبح کی نماز سے فارغ ہونے کے بعد نمازیوں کی طرف اپنا چہرۂ اقدس کر کے تشریف فرما ہوئے تو آپؐ کی نگاہ ایک جوان پر پڑی۔ جوان کے چہرے پر بیداری کے آثار نمایاں تھے۔ آنکھیں دھنسی ہوئی تھیں۔ آنحضرتؐ نے اپنی بصیرت افروز نگاہوں سے سمجھ لیا کہ جو کچھ اس جوان کی حالت ہے وہ کسی اور کی نہیں ہے آپؐ نے اس نوجوان سے دریافت کیا: کیا حال ہے؟ اُس نے کہا: یا رسُول اللہ! اس حالت میں اٹھا ہوں کہ منزلِ یقین تک رسائی حاصل ہو گئی ہے۔" آپؐ نے فرمایا "تمہارے یقین کی کیا نشانی ہے؟ اس نے جواب دیا: "میرے یقین کی نشانی میرے دل کا غمگین ہونا ہے۔ میرے یقین نے مجھ سے نیند کو ختم کر دیا ہے۔ اب میں دن میں روزہ رکھتا ہوں۔ اے رسولِ خداؐ! میں یقین کی اس منزل تک پہنچ چکا ہوں کہ اہلِ بہشت کو گویا دیکھنے لگا ہوں اور میری نظروں کے سامنے آتشِ جہنم اور اس کے بھڑکتے ہوئے شعلے ہیں۔

آنحضرتؐ نے فرمایا: "اس بندے کے دل کو حق تعالیٰ نے نورِ یقین سے منور کردیا ہے۔ پھر آپؐ نے فرمایا: "ہمیشہ ہوشیار رہنا! جو نور خدائے تعالیٰ نے تمہیں عنایت فرمایا ہے وہ ختم نہ ہونے پائے۔"

شرح صدر کی نشانیاں

ہم نے بیان کیا کہ ایمان کا دوسرا درجہ یقین ہے۔ یقین ایک نور ہے جو خداوندمتعال کی جانب سے بندے کو عطا ہوتا ہے اور اس سے بندے کا دل منور ہو جاتا ہے۔ اسی کو روایات واحادیث کی روشنی میں شرحِ صدر کہا جاتا ہے۔ تفسیر مجمع البیان، دوسری تفاسیر اور اسی طرح احادیث کی دیگر کتابوں میں ہے کہ حضرت محمد مصطفیٰؐ سے سوال کیا گیا: "یہ ایک نور ہے جو خداوندعالم بندۂ مومن کے دل میں پیدا کردیتا ہے۔ اسے کوئی نہیں سمجھ سکتا۔" پھر سوال کیا گیا: هَلْ فِی ذٰلِكَ عَلَامَةٌ؟ یعنی: "کیا اس کی کوئی پہچان ہے؟" آپؐ نے اس کی نشانیاں بتلائیں۔ ہمیں چاہیئے کہ ہم ان نشانیوں کو جان کر اپنا جائزہ لیں کہ کس حد تک ہم میں موجود ہیں۔ آنحضرتؐ فرماتے ہیں:

التجافی عن دار الغرور والانابة الی دار الخلود والاستعداد للموت قبل حلول الفوت

مطلب یہ کہ شرح صدر رکھنے والا اس دارِ فانی سے فرار اختیار کرنے کی خواہش رکھتا ہے اس کا دل ہمیشہ رہنے والے گھر کی طرف مائل رہتا ہے اور وہ موت آنے سے پہلے پہلے خود کو اس کے لئے آمادہ کرلیتا ہے۔

مطلب یہ کہ شرح صدر رکھنے والا اس دارِ فانی سے قرار رہنے والے گھر کی طرف مائل رہتا ہے اور وہ موت آنے سے پہلے پہلے خود کو اُسکے لئے آمادہ کر لیتا ہے۔

خلاصہ یہ کہ شرح صدر جس میں پیدا ہو جائے وہ ہمیشہ اس فکر میں لگا رہتا ہے کہ اس کا حشر کن لوگوں کے ساتھ ہوگا۔ وہ "اصحاب یمین" (سیدھے ہاتھ میں نامۂ اعمال پاکر کامیاب ہونے والوں) میں شامل ہوگا یا "اصحابِ شمال" (الٹے ہاتھ میں نامۂ اعمال پاکر ناکام ہونے والوں) میں شامل ہوگا۔ اس کی نگاہ میں دنیا کی مادی زندگی کوئی اہمیت نہیں رکھتی! دنیا کے باہمی جھگڑے، فساد مال و دولت ایسی حقیر چیزوں اور دل کی تاریکیوں کے سبب ہوتے ہیں۔ جب انسان کا دل روشن ہو جاتا ہے تو انسان سمجھدار اور بزرگ بن جاتا ہے۔ اس کے نزدیک یہ دنیاوی چیزیں بچوں کے کھیلنے کی گیند جیسی ہوتی ہیں۔ وہ بچوں کی ایک معمولی سی چیز کے لئے آپس میں جھگڑا نہیں کرتا۔ وہ اس حقیر سی دنیا کے حصول کی خاطر قطعِ رحمی نہیں کرتا اور اپنے رشتہ داروں کو ناراض نہیں ہونے دیتا۔

وحدانیّت کا اقرار

لَا اِلٰہَ اِلَّا اللہ یعنی کلمۂ توحید کی گواہی

اور وحدانیت کا اقرار دل کی گہرائی سے ہونا چاہیئے۔ خداوند متعال جسم و جسمانیت سے منزہ ہے۔ اُسے ظاہری آنکھوں سے نہیں دل کی آنکھوں سے دیکھا

جاسکتا ہے کہ تمام آسمان اور زمین، نیز جو کچھ عالم میں مادّی اور غیر مادّی اشیاء ہیں ان سب کا خالق خدائے لاشریک ہے۔ سورۂ زُخرف کی آیت ۸۴ میں ارشاد ہوا:

وَهُوَ الَّذِیْ فِی السَّمَآءِ اِلٰهٌ وَّفِی الْاَرْضِ اِلٰهٌ

یعنی: "آسمانوں پر بھی اُسی کی عبادت کی جاتی ہے اور وہی زمین میں بھی معبود ہے۔"

کائنات کے ذرّے ذرّے پر اسی کی حکمرانی ہے۔ وہی اس نظام کو چلانے والا ہے۔ حقیقتِ توحید کا مطلب یہ ہے کہ انسان خدا کی واقعی معرفت حاصل کرے۔ یہی تو وجہ ہے کہ خداوند متعال نے قسم کھا کر یہ فرمایا ہے کہ اہلِ توحید ہمیشہ جہنم میں نہیں رہیں گے اور مشرک و کافر بہشت میں نہیں جا سکیں گے۔ معلوم ہوا کہ توحید کا مقام اور مرتبہ انتہائی بلند ہے۔ خاتونِ جنت حضرت فاطمہ سلام اللہ علیہا فرماتی ہیں:

"وَانَار فی التفکّر معقولھا"

یعنی: "اگر کوئی حقیقتِ توحید کو ادراک کرلے تو یہ عظیم نور اس کی فکر کو نورانی کر دیتا ہے۔" اب وہ جو کچھ بھی سمجھتا ہے اور جو کچھ بھی بولتا اور کرتا ہے سب کا سب اسی نور سے متعلق ہوتا ہے۔ یعنی اس کی سوچ توحیدِ الٰہی کے تابع ہو جاتی ہے۔

اس کے مقابلے میں جو توحید کا قائل نہیں ہوتا اور اس کی واضح حقیقت کو نہیں سمجھتا یقیناً اس کے خیالات اس کی گفتگو اور اس کی تحریریں شکوک و

شبہات اور وہم گمان پر مبنی ہوتی ہیں۔ یہی تو وجہ ہے کہ غیر دینی اور اخلاق سوز لٹریچر پڑھنے کے بعد دلوں کی تاریکیاں مزید بڑھ جاتی ہیں۔

ہم اب پھر اسی بات کو ایک مرتبہ اور دہراتے ہیں کہ بغیر علم و معرفت کے خدا کی وحدانیت کی گواہی دینا فائدہ مند نہیں ہے۔ چنانچہ سورۂ محمدؐ کی انیسویں آیت میں ارشاد ہوتا ہے: فَاعلم انّهٗ لا اِلٰهَ اِلّا اللّٰه۔ یعنی: "پس تم اچھی طرح جان لو کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں ہے" اسی طرح سورۂ آل عمران کی اٹھارویں آیت میں ارشاد ہوا: شَهِدَ اللّٰهُ انّهٗ لا اِلٰهَ اِلّا هُوَ وَالملائکة واولوا العلم قائماً بالقسط۔ یعنی: خدا، فرشتوں اور صاحبانِ علم نے گواہی دی ہے کہ اس کے سوا کوئی معبود قابلِ عبادت نہیں ہے اور وہ خدا عدل و انصاف کے ساتھ (کائنات کا نظام) سنبھالنے والا ہے۔"

مختصر یہ کہ یقین کے ساتھ وحدانیت کا اقرار ہونا چاہیئے۔ توحید کی گواہی دینا چاہیئے گویا خدا کو اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہوں۔ توحید کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے بھی ہو جاتا ہے کہ شہید ثانی علیہ الرحمہ نے کتاب شرح لمعہ میں پیغمبر اکرمؐ سے یہ حدیث نقل کی ہے کہ جو شخص اپنی زندگی کے آخری وقت میں لا اِلٰهَ اِلّا اللّٰه کہہ کر دنیا سے اُٹھے گا وہ داخلِ بہشت ہوگا۔ جنابِ فاطمہ زہراؑ پہلے یہ گواہی دیتی ہیں کہ خدائے یکتا کے علاوہ کوئی خدا نہیں ہے۔ اس کے بعد مزید معرفت سے آگاہ کرتے ہوئے بیان فرماتی ہیں:

"کلمة جعل الاخلاص تاویلها"

یعنی کلمہ "لا اِلٰهَ اِلّا اللّٰه" مختصر الفاظ کا مجموعہ ہے۔ لیکن اس

کے معنی بہت وسیع ہیں۔ اس کی حقیقت دل میں خلوص نیت کا پایا جانا ہے اگر کسی نے صدقِ دل سے یہ کلمہ پڑھا تو وہ جنّت کا حقدار ہے اور اگر کلمہ کو صرف زبان سے دُہرا دیا تو اس کی کوئی قدر و قیمت نہیں ہے۔

ذہانت اور عاقبت اندیشی

والیقین علی اربع شعب تبصرۃ الفطنۃ وتاویل الحکمۃ ومعرفۃ العبرۃ وسنۃ الاولین....

یقین کیسے پیدا ہوتا ہے؟ یقین کے چار حصّے ہیں۔ منزلِ یقین تک پہنچنے کے لئے چار مرحلے ہیں۔ اوّل ذہانت، دوسرے حکمت و دانائی، تیسرے عبرت اور چوتھے گزشتہ لوگوں کے طور طریقوں سے آشنائی۔

پہلا مرحلہ ذہانت ہے آدمی دنیاوی معاملات میں کتنا باریک بین ہوتا ہے۔ اپنی دنیا بنانے کے لئے اور کاروبار کو ترقّی دینے کے واسطے کتنی ہوشیاری سے کام لیتا ہے۔ کاش یہی ذہانت اور ہوشیاری معرفتِ پروردگار اور معارف اسلامی سے آشنائی حاصل کرنے کے لئے بھی استعمال کی جاتی آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے مروی ہے: اَلْمُؤْمِنُ کَیِّسٌ "مومن ذہین ہوتا ہے"۔ کیا آپ سمجھتے ہیں کہ شیطانی کام بڑھ چڑھ کر کرنا ذہانت ہے؟ مال و دولت اور مقام و مرتبہ حاصل کرنے کے لئے ذہنی قوت کا استعمال واقعی ذہانت نہیں ہے بلکہ اسے ذہانت سے ملتی جلتی چیز کہا جا سکتا ہے۔

واقعی اور حقیقی ذہانت حضرت علیؑ اور ان کے پیروکاروں کا حصّہ

ہے۔ کیونکہ وہ سمجھتے ہیں کہ دنیا کی کوئی قدر و قیمت نہیں ہے جیسا کہ آنحضرتؐ فرماتے ہیں: "جو شخص سفرِ آخرت کے لئے زادِ راہ مہیا کرے وہ ذہین ہے اور جو شخص دنیا کے لئے کام کرتا رہے لیکن بہترین آخرت کی اُمید لگائے وہ احمق ہے۔" مرنے کے بعد آدمی کو وہی گھر ملے گا جو اس نے دنیا میں اپنے صالح عمل سے تیار کیا ہوگا۔ برزخ اور قیامت کا تعلق بھی اسی دنیا کے ایمان و عمل سے ہے۔

لَا دَارَ لِلْمَرْءِ بَعْدَ الْمَوْتِ یَسْکُنُھَا
اِلَّا الَّذِیْ کَانَ قَبْلَ الْمَوْتِ بَانِیْھَا

مرنے کے بعد آدمی کو وہی گھر رہنے کو ملے گا جو اُس نے موت سے پہلے اپنی زندگی میں بنایا ہوگا۔" لہٰذا انسان کو چاہیئے کہ آخرت کا گھر بنانے کی بابت اسی دنیا میں سوچے۔ اُسے وہاں ساٹھ مربع گز والا چھوٹا سا مکان چاہیئے یا دو سو گز پر مشتمل گھر چاہیئے۔ اور اگر وہ ایسا وسیع مکان چاہتا ہے کہ جس کے حدود آنکھوں کی انتہائی بصارت تنگ ہوں تو پھر اس کے لئے اسی دنیا میں کوشش کرنی چاہیئے۔ اگر دنیا میں کوشش کر کے آخرت کا گھر حاصل کر لیا تو ٹھیک ہے۔ ورنہ جہنم کی ہولناک کھائی کے سوا اور کچھ نہیں ملے گا۔

ذہانت اور خُدا پر ایمان

ذہین آدمی خُدا پر کامل ایمان رکھتا ہے۔ اس کی نظر آخرت پر ہوتی ہے۔ ذہانت سے کام لو! مخلوقاتِ عالَم کے خالق کو پہچانو! ہر مخلوق

کا خالق ہوتا ہے لہٰذا تمہارا بھی خالق ہے۔ اپنے خالق حقیقی کی اچھی طرح معرفت حاصل کرلو۔ تمہارا خدا پر ایمان تقلیدی نوعیت کا اور معمولی سا نہیں ہونا چاہیئے۔ ورنہ بڑا پچھتاوا ہوگا۔ خدا پر ایمان میں تو اضافہ ہی ہوتے رہنا چاہیئے۔ وہ خدا جس نے گہوارے کی ابتدائی زندگی میں تمہیں رزق پہنچانے کا بندوبست کیا وہ کیا اب بڑے ہو جانے کے بعد تمہیں رزق نہیں دے گا؟ اس وقت ماں کے دودھ کے ذریعے غذا فراہم کی اور اب کسی اور طریقے سے بندوبست فرمائے گا۔ پھر تم اپنی روزی کے سلسلے میں فکرمند کیوں ہو اور کس بات پر برہم ہو؟ ہوا و ہوس میں پڑ گئے ہو؟ اپنی زندگی کو بوجھ سمجھنے لگے ہو؟ کیا یہ گمان کرنے لگے ہو کہ تمہارا کوئی رب نہیں ہے؟! اگر ایسا ہے تو ذرا یہ بتاؤ کہ پھر اللہ کسے رزق دیتا ہے؟ یاد رکھو! تم خدا کی مخلوق ہو، اسی نے تمہیں پیدا کیا ہے اور وہی تمہیں رزق بھی دیتا ہے۔ لوگوں کا اس بری طرح روزی کے سلسلے میں فکرمند ہونا اس کی رزاقیت پر شک کرنے کے مترادف ہے اور یہ کفر و الحاد کی پیداوار ہے۔

رَبُّ العَالمین کے معنیٰ

ہم روزانہ پانچ وقت کی نمازیں پڑھتے ہیں اور کم از کم دس مرتبہ "رب العالمین" کے الفاظ زبان پر لاتے ہیں۔ اس کا مطلب صرف یہی نہیں کہ اللہ تعالیٰ سارے جہانوں کا پالنے والا ہے بلکہ یہ جملہ دل کو یہ اطمینان بھی بخشتا ہے کہ یقیناً اس کا خالق اور دوسری تمام مخلوقات کا خالق ایک ہے۔ اگرچہ کہ

الفاظ سے براہِ راست یہ مطلب نہیں نکلتا لیکن ضمناً یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ تم اپنے قلب و جسم کو پاک و پاکیزہ رکھو اور اسی رب العالمین کے احکام اس پر جاری کرو۔

جب کوئی رب العالمین کہہ کر پکارتا ہے تو درحقیقت اس کا مطلب یہ ہوا کہ وہ اسے زمین پر رینگنے والے کیڑے سے لے کر ہاتھی، انسان، جن فرشتے، زمین، آسمان اور دیگر تمام مخلوقات کی نگہبانی کرنے والا اور انہیں عاقلانہ طور پر چلانے والا خدائے وحدہٗ لاشریک سمجھتا ہے۔ وہ اس بات پر یقین رکھتا ہے کہ کائنات کا ذرہ ذرہ اسی کے زیرِ تربیت ہے۔ وہ سب کچھ پیدا کرنے والا ہے اور اسے ارتقائی منزلوں تک پہنچانے والا ہے۔ جس طرح وہ میرا ربّ ہے اسی طرح تمام دوسری مخلوقات کا رب ہے۔ وہی مجھے اور سب کو روزی پہنچانے والا ہے۔

جب کوئی اس منزل تک پہنچ جاتا ہے تو اُس کا دل ایمان اور حقیقی اسلام کی لذتوں سے آشنا ہو جاتا ہے۔

یقینؔ سے توکلّ

حضرت علی علیہ السّلام سے لوگوں نے پوچھا "ایمان کی حد کیا ہے"؟ آپؑ نے فرمایا: "یقین"۔ پھر لوگوں نے پوچھا: وَمَا حَدُّ الْيَقِيْنِ "اور یقین کی حد کیا ہے"؟ حضرت علیؑ نے فرمایا: التوکل علی اللّٰہِ۔ "خدا پر بھروسہ کرنا"۔

حضرت امیر المومنینؑ کے اس ارشاد گرامی کی روشنی میں واضح ہو جاتا ہے کہ ایمان کے ذریعے یقین تک رسائی حاصل ہوتی ہے۔ پھر یقین سے خدا پر توکل پیدا ہوتا ہے۔ یعنی یقین سبب ہے اور توکل مسبّب، اہمیت مسبّب کو حاصل ہو جاتی ہے اور اصل مطلوب و مقصود ہوتا ہے لہٰذا جب بندۂ مومن خدا پر توکل کرنے والا ہو جاتا ہے اور اپنے تمام امور اسی کے سپرد کر دیتا ہے تو اسے ظاہری اسباب کے منقطع ہو جانے کی پرواہ نہیں ہوتی۔

خدا پر زیادہ اعتقاد

حضرت امیر المومنینؑ نے فرمایا:

"لایصدق ایمان عبد حتی یکون بما فی ید اللہ اوثق مما فی یدہ

یعنی: بندۂ مومن کا ایمان اس وقت تک سچا اور پورا نہیں ہو سکتا جب تک کہ وہ اپنے پاس موجود چیزوں کے مقابلے میں خدا کے پاس موجود چیزوں پر زیادہ اعتماد نہ کرے۔

مولائے کائنات کے اس فرمان کے مطابق مومن کے ایمان کی سچائی کا معیار اپنے پاس موجود ظاہری وسائل کے مقابلے میں خدا پر زیادہ بھروسہ کرنا ہے۔ چنانچہ اب کسی حساس موقع پر آدمی کے طرز عمل کو دیکھ کر فیصلہ کیا جا سکتا ہے کہ اس کا قلبی لگاؤ بینک بیلنس، حیثیت، اور اپنے رشتہ داروں

سے اسکی اُمید زیادہ ہے یا خدا سے۔ اب جس سے بھی زیادہ امید قائم کرے گا تو معلوم ہوگا کہ اسی پر اس کا ایمان زیادہ ہے۔ آدمی بیماری کی حالت میں ڈاکٹر اور دوا پر زیادہ بھروسہ کرتا ہے یا خدا پر۔ اگر اس کی نگاہیں ظاہری اسباب تک ہی ہیں تو خدا اور اس کا ربّ اور مدبّر امور ہونا کہاں گیا؟ کیا روایات و احادیث میں ہم سے یہ نہیں کہا گیا کہ اگر تمام ظاہری اسباب ہم سے یا دوسروں سے منقطع ہو جائیں تب بھی خدا سے لو لگائے رکھیں اور اسباب کے منقطع ہو جانے کی پروا نہ کریں۔

زیادہ تعلیم اور یقین

حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

لَیْسَ العلم بکثرۃ التعلیم بل ھو نور یقذفہ اللہ فی قلب من یشاء)

یعنی: "علم زیادہ پڑھنے سے حاصل نہیں ہوتا بلکہ وہ تو ایک نور ہے اور اللہ تعالیٰ جس کی ہدایت چاہتا ہے اس کے قلب میں پیدا کر دیتا ہے"

اس حدیث شریف میں جس علم کی بات کی گئی ہے اس سے مُراد اللہ تعالیٰ کی معرفت اور اس کی صفات حسنہ کا دل کی گہرائی سے اقرار کرنا ہے اور اسی کو یقین کہا جاتا ہے۔ انسان خواہ اپنی طرف سے کتنی ہی محنت کرلے

اور علم کے حاصل کرنے میں لگا رہے لیکن یقین کا نور بغیر عطائے پروردگار کے حاصل نہیں ہو سکتا۔ جس شخص میں جتنا قبول کرنے کی صلاحیت ہوتی ہے اسے ربّ العزت کی جانب سے اتنا مل جاتا ہے۔ انسان کو چاہیئے کہ وہ ہمیشہ اچھے کام کرتا رہے۔ اور کبھی خدا کو فراموش نہ کرے۔ ایسی صورت میں ان اعمال کا لازمی طور پر توقع سے زیادہ اچھا نتیجہ ظاہر ہو گا۔ چنانچہ دعائے افتتاح میں کیا خوب آیا ہے "وَأَعْطِنَا بِهِ فَوقَ رَغْبَتِنَا" یعنی جو میرے وہم وگمان میں بھی نہیں ہے وہ بھی تو مجھے عطا فرمائے گا۔

خدا سے امید رکھتے ہوئے اور اسی پر بھروسہ کرتے ہوئے نمازِ جماعت میں شرکت کیجئے اور خلوصِ نیّت کے ساتھ حجِ بیت اللہ کا شرف حاصل کیجئے۔ توقع سے بڑھ کر روحانی فوائد حاصل ہوں گے۔ لیکن اگر یہی جماعت میں شرکت اور حج آپ کو خوش فہمی میں مبتلا کر دے اور آپ خود کو جنّت میں محسوس کرنے لگیں اور یہ کہتے پھریں کہ بس میں جماعت کا پابند ہوں اور کئی مرتبہ سفرِ حج کر چکا ہوں تو "اس" "میں" کی وجہ سے کام خراب ہو جائے گا۔

کیا جنّت اعمال کے عوض ملے گی؟

احادیث میں ہے کہ دنیا اور جو کچھ بھی ہے اس میں وہ سب کچھ جنّت کی ایک بالشت جگہ سے زیادہ قدر و قیمت نہیں رکھتا۔ تو کیا آپ یہ سمجھ بیٹھے ہیں کہ اپنے ان جزئی نوعیت کے اعمال کے عوض اسے خرید لیں گے۔ اور وہ بھی ایسے جزائی اعمال کے بدلے خرید لیں گے جو خود پسندی، غرور اور،

جہالت سے بھرے ہوئے ہوں!! اگر آپ بڑے بڑے بلند قامت پہاڑوں کے برابر صحیح عمل کرلیں تب بھی اس سے جنّت نہیں حاصل کرسکتے کیونکہ جو کچھ بھی اطاعتِ خداوندی آپ کرتے ہیں یہ اسی کی دی ہوئی طاقت اور توفیق سے آپ انجام دیتے ہیں۔ اور اگر یہ فرض بھی کرلیا جائے کہ یہ اطاعت آپ خود کرتے ہیں تب بھی اس کے بدلے میں آپ جنّت کے حقدار نہیں قرار پاسکتے۔ لہٰذا سب کچھ کرنے کے بعد بھی رحمتِ خدا کی اُمید کیجئے۔ اپنے اعمال پر نازمت کریں۔ یہ دُعا کریں کہ خداوندا بحق محمدؐ وآل محمدؐ ہمیں سمجھ بوجھ اور بصیرت عطا فرما۔ اسلام کے احکام کو اس طرح سے انجام دینے کی توفیق دے جو قبولیت کا شرف حاصل کرلیں۔ خداوندا! تو ہمیں اللہ پر توکل کرنے والوں میں شامل فرما اور ہم میں اخلاص پیدا کردے۔

وہ کام جو بلاشبہ اچھے ہیں:

جب آدمی کے دل میں کسی کام کے کرنے یا نہ کرنے کے بارے میں جذبات پیدا ہوتے ہیں تو وہ تین طرح کے ہوتے ہیں۔ اوّل وہ ایسا کام ہوگا جس کا کرنا بلاشک وشُبہ اچھا ہوگا۔ ظاہر ہے یہ رحمانی کام ہے۔ اسے بجالانے میں یقینی طور پر فلاح اور خیر ہے۔ پس جب قلب پر کسی کام کے سلسلے میں ایسی کیفیت طاری ہو تو اسے بجالاؤ اور پکا عزم کرلو کہ ایسے کاموں کو بجالاتے رہوگے۔ ایسے کاموں کی مثال شرعی واجبات سے دی جاسکتی ہے۔

وہ کام جو بلاشبہ بُرے ہیں

دوسرے وہ ایسا کام ہوگا جس کے بارے میں انسان کا دل یہ گواہی دینے لگے گا کہ یہ بلاشبہ شیطانی کام ہے۔ اگر ایسا ہے تو اس قسم کے کام کو چھوڑ دینا چاہیئے اور کبھی اس کے کرنے کا ارادہ بھی نہیں کرنا چاہیئے۔ اور دلی خواہشات کو ترک کر کے عقل و بصیرت سے کام لینا چاہیئے۔ اس قسم کے لئے شرعی طور پر ممنوع اور حرام کاموں کی مثال دی جاسکتی ہے۔

مشکوک اُمور میں کیا کریں

تیسری قسم کا تعلق مشکوک اُمور سے ہے۔ جب انسان حیران ہو اور دلی احساسات اور جذبات یہ فیصلہ نہ کر پائیں کہ یہ رحمانی کام ہے یا شیطانی تو اسے کیا کرنا چاہیئے؟ اکثر شرعی طور پر مباح کام اسی قسم میں آسکتے ہیں۔

وہ افراد جو تقویٰ کے بلند مرتبے پر فائز ہیں، ان کی تعداد سرخ یاقوت کی طرح بہت کم ہے۔ ایسے ہی منزلِ تقویٰ رکھنے والے اپنے قلب کی نورانیت سے سمجھ لیتے ہیں کہ یہ کام اچھا ہے یا بُرا۔ اور پھر ان میں کسی قسم کا شک و تردد باقی نہیں رہتا۔ وہ اپنے قلب میں موجود ایمان و یقین کے نور سے تاریکیوں کو الگ کر دیتے ہیں اور جیسا کہ میں نے کہا ایسے صاحبانِ یقین کی تعداد بہت کم ہے۔ اتنی کم کہ انہیں انگلیوں پر شمار کیا جاسکتا ہے۔ خداوندا! بحق محمدؐ و آلِ محمدؐ ہمیں ایمان، یقین اور اللہ پر توکل کی توفیق عنایت فرما۔